زبان اور کلچر

۳۵۴۲۱

شکیلُ الرحمٰن

پبلشرز:۔ شاہین بکسٹال سرینگر کشمیر

بار اول ..... ایک ہزار

ماہ اپریل ۱۹۵۸ء

مطبع ..... برڈ کا پریس سری نگر

قیمت ..... سات روپے آٹھ آنے

(جملہ حقوق پہلا ایڈیشن بحق پبلشر محفوظ ہیں)

پبلشرز

شاہین بک سٹال سرینگر کشمیر

انتساب

اپنی

رفیقۂ حیات

عصمت شکیل

کے نام

شکیل الرحمٰن

ترتیب

مقدمہ	صفحہ نمبر	تا صفحہ نمبر
زبان اور کلچر	صفحہ نمبر	تا صفحہ نمبر

مقدمہ

زبان کسی ایک فرد کی جائداد
نہیں۔ یہ عوام کی ملکیت ہوتی
ہے جو سماجی، سیاسی اور جغرافیائی
حادثوں سے جنم لیتی ہے۔ زبان
انسان کی قوت ہے۔ انسان فطرت
سے جنگ کرنے میں جتنی مدد اس
قوت سے لیتا ہے اتنی مدد اسے
کسی دوسری قوت سے نہیں ملتی
زبان انسانی تعلقات کی سچائی
کا ثبوت ہے (شکیل الرحمٰن)

عرصہ ہوا مجھے ایک کتاب ملی تھی۔ غالباً ۱۸۷۸ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی تھی۔ قدیم چین کے حالات اس میں درج تھے۔ کتاب کے بہت سارے اوراق غائب تھے۔ اور جو بچ گئے تھے۔ ان پر کیڑوں کی مہربانیاں ہو گئی تھیں۔ مجھے اس کتاب کے نام کا بھی پتہ نہ چل سکا۔ مجھے یاد ہے میں نے بہت مشکل اور بڑی محنت سے وہ کتاب پڑھ ڈالی تھی۔ جو صفحے غائب تھے یا جو کیڑوں کی نذر ہو گئے تھے۔۔۔ انہیں نہ پڑھنے کا افسوس آج بھی ہے۔ اسی کتاب سے شروع میں چینی زبان کے متعلق بہت ساری باتیں معلوم ہوئی تھیں لسانیات میں میری دلچسپی دراصل اسی کتاب سے بڑھی۔ معنی کی مناسبت سے بعض حرفوں کی ترتیب نے مجھے بہت ساری کتابیں پڑھ جانے کے لئے اُکسایا مثلاً ایک لفظ تھا

جہاز = 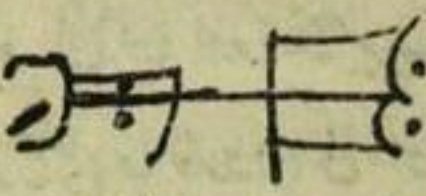

اس لفظ میں "طوفان نوح" کی تاریخ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس لفظ کو یوں تقسیم کیا جا سکتا ہے ــــ

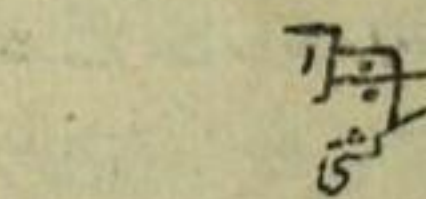

یعنی ایک ایسا جہاز یا ایسی کشتی جس میں آٹھ آدمی (ہڈیاں) سوار ہوں۔ حضرت نوحؑ، ان کی رفیقۂ حیات اور چھ بچے۔ معنی کی مناسبت سے بعض حرفوں کی ترتیب سے مجھے قطعی تشفی نہیں ہوئی تھی۔ مثلاً ایک لفظ تھا

اس لفظ میں حوّا کے گناہ کی طرف اشارہ ہے۔ اس لفظ کو یوں سمجھا جا سکتا ہے

درخت عورت درخت

یعنی حوّا (عورت) دو درختوں کے درمیان ـــ ایک درخت کو برا کہا جا سکتا ہے اور دوسرے کو اچھا۔ یعنی ایک عورت جو برے اور اچھے درخت کے درمیان پریشان ہو۔ اس قسم کے بہت سارے الفاظ تھے۔ لسانیات میں میری دلچسپی دراصل اسی کتاب سے بڑھی اور پھر میں نے اس سلسلہ کی بہت ساری کتابیں پڑھ ڈالیں

انسان کی پیدائش سب سے پہلے کہاں ہوئی اور انسان نے سب سے پہلے کونسی زبان استعمال کی۔ اس کا ہمیں کوئی علم نہیں۔ قیاس آرائیاں بہت ہوئی ہیں اور اندھیرے میں خوب ہاتھ پاؤں مارے گئے ہیں کوئی کہتا ہے کہ جنگلی جانوروں کی آواز کی نقل سے زبان پیدا ہوئی اور کوئی یہ کہتا ہے کہ کسی زہریلے کیڑے کی ڈنک یا جنگلی جانور کے حملہ سے انسان کی چیخ نے زبان پیدا کر دی۔ پھر مسرت اور لطیف جذبات کا کھل کر اظہار ہوا۔ اور رقص کے ساتھ ساتھ گانوں نے زبان میں سماجی آہنگ کو تیز کیا۔ شروع میں ڈیموکریٹس (democritus) نے کہا تھا کہ زبان انسان کی تخلیق ہے لیکن آواز اور الفاظ کا ان چیزوں سے تعلق برائے نام ہے۔ جن چیزوں کی طرف انسان آواز یا الفاظ سے اشارہ کرتا ہے ایپی کیورس (epicurus) نے بتایا تھا کہ زبان کی تخلیق

قدرتی ہے۔ الفاظ قدرتی طور پر بن گئے ہیں اور بنتے رہیں گے۔ الفاظ کی تخلیق زندگی کی ضرورتوں کے مطابق قدرتی طور پر ہوئی ہے۔ انہتا اس وقت ہو جاتی ہے جب عیسائیت کے پھیلنے کے بعد زبان کو الہامی شے سمجھا گیا۔ انیسویں صدی میں ال۔ جی بونالڈ (L. G. Bonald) نے بتایا کہ آواز خیالات کی تخلیق کرتی ہے (خیالات آواز کی تخلیق نہیں کرتے) اسلئے زبان انسان کی تخلیق نہیں ہو سکتی زبان براہِ راست خدا کی طرف سے انسان کے پاس آئی ہے۔ آواز خدا کی زبان ہوتی ہے اور اچھے نئے الفاظ اور اچھی نئی آواز صرف انھیں نصیب ہوتی ہے جو خدا کے قریب ہوتے ہیں۔ ہرڈر (Herder) نے ۱۷۷۲ء میں بونالڈ کے اس خیال پر سخت تنقید کی تھی۔ اسے بونالڈ کے خیالات سے شدید اختلاف تھا۔ اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ زبان ایک قدرتی تحفہ ہے۔ اس سلسلہ میں باتیں جو کچھ بھی ہوں لیکن اسکا اعتراف سارے ماہرین نے کیا ہے کہ زبان جذبات کے اظہار کا سب سے اعلیٰ ذریعہ ہے۔ زبان جذبات کی سانس ہے۔ اس سانس کی خوشبو سے انسان کی سرمستی قائم رہتی ہے۔ یہ سانس اکھڑ جائے تو جذبات کی لہریں خاموش ہو جائیں۔ ساری خوشبو اُڑ جائے سارے گیت اداس ہو جائیں اور شہد کی مٹھاس اور شیرینی باقی نہ رہے

نیل کی وادی ایک نئی تہذیب کا گہوارہ تھی۔ اسکے ہزاروں سال بعد مغرب کے لوگوں نے صرف مکان بنانا سیکھا تھا۔ مصریوں نے بہت ساری باتیں بنائی تھیں۔ مصری بہت محنتی تھے۔ کسان بھی تھے۔ کھیتوں کو سینچنے میں انہیں کافی مہارت حاصل تھی۔ مصریوں نے آیندہ نسل کیلئے اپنی کہی ہوئی باتوں کو پتھروں اور لکڑیوں پر محفوظ رکھا۔ لکھنے کا فن صحیح معنوں میں مصریوں کے یہاں ایک نئی صورت میں نظر آتا ہے۔ جب رومن مصر میں آئے

تو انہیں اپنی لاکھوں ننھی ننھی حیرت انگیز تصویریں ملیں جن کا تعلق ملک کی تاریخ سے نہایت گہرا تھا۔ رومن چونکہ بڑے مغرور تھے اور انہیں اپنے ملک کے علاوہ دوسرے کسی بھی ملک کی کوئی بات پسند نہیں تھی۔ اسلئے لوگوں نے اسطرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ اور مندروں، دیواروں اور محلوں پر بنی ہوئی حیرت انگیز تصویریں حیرت سے ان کا منہ دیکھنے لگیں۔ عرصہ تک مصر کی وادی عجائب خانہ بنی رہی۔ سنہ ۱۷۹۸ء میں نپولین، برٹش انڈین کلانیز پر حملہ کرنے کے خیال سے آگے بڑھا لیکن نیل سے آگے نہیں جاسکا۔ اس کے ساتھی تھک کر بیٹھ گئے۔ کہا جاتا ہے کہ انہیں لوگوں میں بعض سپاہیوں کو مصر کی ان تصویروں سے دلچسپی بڑھ گئی اور سنہ ۱۸۲۳ء میں فرانس کے مشہور پروفیسر چمپولین (Champollion) نے اس سلسلہ میں بڑی تحقیق کی۔ سنہ ۱۸۵۲ء میں چمپولین نے اعلان کیا کہ وہ مصریوں کی چودہ تصویروں کو پڑھ سکتا ہے۔ اسکے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد چمپولین زیادہ کام کرنے کی وجہ سے بیمار ہوگیا اور اسکا انتقال ہوگیا۔ چمپولین کی تحقیقات سے یہ صرف فائدہ ہوا کہ مصری تصویروں کو پڑھنے کے بہت سارے اصول معلوم ہوگئے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہم مصر کی ایکہزار سال قبل مسیح تک کی تاریخ کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ مصر کے لوگ جس چیز کی تصویر بناتے تھے ضروری نہیں تھا کہ اس تصویر سے اس چیز کی طرف اشارہ ہو۔ مصری بہت عقلمند تھے۔ ایک تصویر سے بہت سی باتیں معلوم ہوسکتی تھیں۔ یہ پڑھنے والے کے تیز شعور کا کام تھا جو اسے سمجھ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ہم بہت ساری تصویروں کو نہیں سمجھ سکے ہیں۔

تھامس ینگ (Thomas young) (سنہ ۱۷۷۳ء — سنہ ۱۸۲۹ء) نے بھی اسکی کوشش کی تھی۔ مصر کے ابتدائی حروف کا صحیح

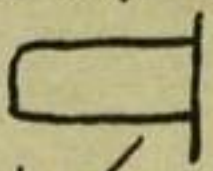

مطلب صاف ہو۔ زوئیگا (Zoega) (۱۷۵۵ء — ۱۸۰۹ء) نے
جہاں اور بہت ساری باتیں صحیح ثابت کی ہیں وہاں یہ بھی بتایا ہے کہ بادشاہ
کا نام ہمیشہ ایک خاص نشان کے اندر لکھا جاتا تھا۔ اور وہ خاص نشان یہ ہے

لیکن اسکا پتہ نہیں چلتا کہ اس نشان میں کس طرف سے بادشاہ کا نام لکھا
جاتا تھا۔ برٹش میوزیم میں روسیتا پتھر (Rosetha stone) ہے۔ اس
سے یہ بات کچھ صاف ہو جاتی ہے۔ اس پتھر پر ٹولیمی کا نام اس طرح لکھا
ہوا ہے:۔

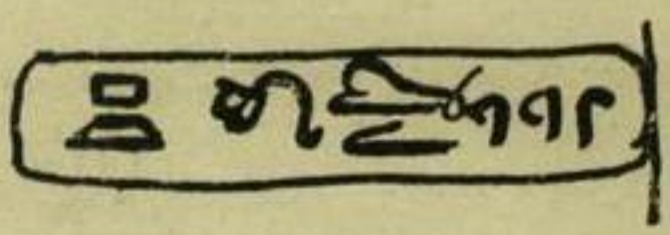

پ
ٹ
و
ل
م
س (اسلیے کہ مصری نام اکثر س ہی پر ختم ہوتے ہیں)

(انہیں حروف علت کہا جا سکتا ہے)

مصر کے بعض خاص حروف یہ تھے:۔

ب
ح
آ

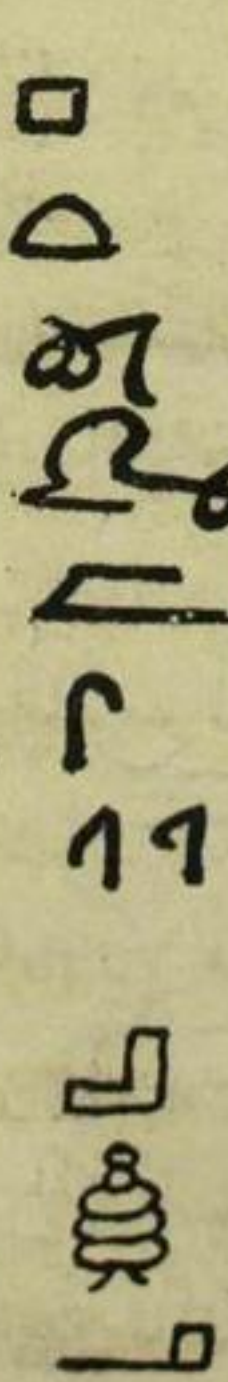

س

ش

ث

ق

ک

پ

ف

م

ج

ٹ

ن

تھ

بادشاہ کے لئے ایک خاص نشان ہوتا تھا۔ اس نشان سے بادشاہ وقت کی طرف اشارہ کرتے تھے

ٹھنڈے پانی کے لئے یہ نشان بناتے تھے:۔

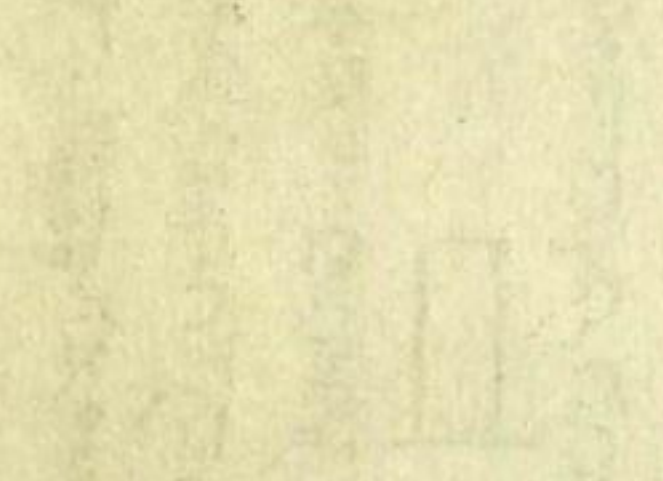

ہوا کے لئے یہ تصویر تھی:۔

مصر کا ادب ابوالہول کے زمانہ سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ حیرت انگیز کہانیں اور شعبدہ بازی کی کہانیاں عام ہو گئی تھیں۔ معجزے کا بیان کہانیوں میں بعد

یں ہونے لگا۔ بارہویں خاندان میں باہر سے آئے ہوئے لوگوں کی کہانیاں پھیل گئیں۔ باہر کے لوگوں کی کہانیاں بڑے ذوق وشوق سے پڑھی اور سنی جاتی تھیں۔ اس انسان کی قدر بہت زیادہ تھی جو باہر کی کہانیاں لوگوں کے لئے لکھتا تھا۔ اٹھارہویں خاندان میں مصر کی کہانیوں میں کردار تراشے گئے۔ بعض کیریکٹر پیش کئے گئے۔ اچھے اچھے گیت اور گانے بھی لکھے گئے۔ موت، انسان خدا اور قلعوں پر اچھی اچھی نظمیں لکھی گئیں۔ موت سے گھبراہٹ کا احساس بھی ان کی نظموں میں ہوتا ہے۔

زبان داخلی اور خارجی دونوں حقیقتوں کے اظہار کا نام ہے حقیقتوں کا یہ اظہار اشاریت میں ہوتا ہے۔ انسان اس طرح اشاروں کا کوئی ابوالہول نہیں بنا لیتا۔ اور نہ اشاروں کا کوئی ایسا انبار لگ جاتا ہے جس سے تخیل کی دنیا میں یا جذبات کی لہروں میں ہنگامے پیدا ہو جائیں۔ ان اشاروں کی ایک ترتیب ہوتی ہے۔ اسی ترتیب کے حسن سے داخلی اور خارجی حقیقتوں کے اظہار میں چمک اور لطافت پیدا ہوتی ہے۔ اگر شروع سے ان اشاروں کی کوئی اپنی ترتیب نہیں ہوتی۔ تو تخیل اور شعور میں گہرائی نہیں ہوتی۔ اور اس گہرائی سے کوئی آفتاب نہیں نکلتا۔ جس طرح خارجی حقیقت سے اشاریت کا کا ایک خاص قسم کا تعلق ہے اسی طرح داخلی حقیقت کا بھی اشاریت سے تعلق ہے۔ اسی تعلق سے اشاریت میں تیزی، لہر، چبھن اور سرستی پیدا ہوتی ہے۔ زبان میں نئے نئے الفاظ ہمیشہ آتے رہتے ہیں۔ اور انہی کے سہارے زبان ترقی کرتی رہتی ہے۔ ایک خاص علاقہ کی معمولی بولی ہزار سال کے بعد ترقی کر کے ایک بڑی قوم کی زبان بھی بن سکتی ہے۔ اسکی ترقی میں نئے الفاظ کے سہارے کا ہاتھ زیادہ رہتا ہے اور نئے الفاظ سماجی تبدیلیوں،

نفسیاتی کشمکش اور معاشی ردوبدل کی وجہ سے بھی زیادہ پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ہر نئے مذہب نے نئے الفاظ کے ذخیرے دئے ہیں۔ ہر معاشی اور سیاسی تبدیلی اور انقلاب نے نئے الفاظ بخش دیئے ہیں۔ اور افراد کی نفسیاتی کشمکش اور نفسیاتی ہنگاموں نے نئے الفاظ کی تخلیق کی ہے۔

الفاظ کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ الفاظ میں قوموں کی تاریخ انسان کے کردار اور جذبات کی صحیح تصویریں ملتی ہیں۔ بعض الفاظ سے ان کی شرارتوں اور حماقتوں کا بھی علم ہوتا ہے اور ان الفاظ کے نفسیاتی اور معاشی پس منظر کو دیکھنے کے بعد ان شرارتوں اور حماقتوں کی حقیقت کا بھی پتہ چلتا ہے بعض لفظوں میں انسان کے خونِ جگر کے چھینٹے ہوتے ہیں۔ وہ الفاظ ہمارے جذبات کی سرحدوں میں بے اختیار اترتے چلے جاتے ہیں اور ہم اپنے دل و دماغ میں ہمیشہ کے لئے انہیں محفوظ کر لیتے ہیں۔ الفاظ کا انسانی آواز سے نہایت ہی گہرا تعلق ہے۔ مصر اور چین میں جو تصویریں بنائی جاتی تھیں وہ صرف تصویریں تھیں۔ ان کا تعلق انسان کی آواز سے "نہیں" کے برابر تھا۔ یہ قطعی دوسری بات ہے کہ ان تصویروں سے مصر اور چین کے رہنے والے اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ ان تصویروں سے انسانی لہجہ اور انسانی آواز کا تعلق براہِ راست نہیں تھا۔ اس طرح بغیر ایک دوسرے کو سمجھے، بغیر ایک دوسرے کے کردار کو جانے لوگ گفتگو کر لیتے تھے اور بہت ساری باتوں سے آگاہ ہو جاتے تھے۔ اور آگاہ کر دیتے تھے۔ یہ بات قدیم فارسی اور موجودہ جاپانی "کانا" (Kana) کے ساتھ بھی نہیں ہے۔ قدیم فارسی اور موجودہ جاپانی "کانا" اشاریت پیش کرتے ہیں۔ اور یہ اشارے انسانی الفاظ سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان کا یہ تعلق اتنا گہرا ہوتا ہے کہ الفاظ اور آواز کی دھڑکنیں

انتہائی قریب ہو جاتی ہیں

نئی تحریک اور نئے نظام نئے الفاظ لاتے ہیں۔ نئی سیاسی تحریک اور نئے نظام زندگی سے زبان نہیں بدل جاتی۔ نئے الفاظ ضرور آتے ہیں۔ پرانے لفظوں کے معنی بھی بدل جاتے ہیں۔ اور زبان کے قواعد میں بھی تبدیلیاں آجاتی ہیں۔ لیکن زبان میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں آتا۔ اسٹالن نے روسی زبان کے متعلق کہا تھا کہ اکتوبر کے انقلاب کے بعد روسی زبان میں کوئی بنیادی تبدیلی واقع نہیں ہوئی اور موجودہ روسی زبان پشکن کی زبان سے قطعی الگ نہیں۔ موجودہ عہد میں یہ تبدیلی ضرور ہوئی ہے کہ الفاظ کا کافی ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔ نئے الفاظ خوب تراشے گئے ہیں۔ بہت سارے الفاظ کے معنی بدل گئے ہیں اور قواعد میں بھی تبدیلیاں آگئی ہیں۔ ان تبدیلیوں کو ایک قسم کا سدھار اور ایک قسم کی ترتیب کہنا چاہیئے۔ عبرانی (Hebrew) زبان سامی (semetic) زبان کی ایک شاخ ہے۔ عربی اور آرمائک اور بابلی زبانوں سے بھی اسکا گہرا رشتہ ہے۔ یہ زبان کنعان میں پھیلی اور بڑھی ہے۔ یہودیوں کی زبان بھی کہتے ہیں۔ یہ زبان اردو کی طرح داہنے سے بائیں لکھی جاتی ہے۔ اسکے پرانے حروف فونی سیفنس (phoenicians) کے حروف معلوم ہوتے ہیں۔ ۷۲۱ سال قبل مسیح سامار یا کے زوال کے بعد آرمائک جو عام زبان تھی عبرانی زبان پر مسلط کر دی گئی۔ پانچویں صدی تک یہ سیننچی رہی۔ کہ عوام اور خواص آرمائک کو اپنی زبان سمجھیں نتیجہ کے طور پر عبرانی کی بہت ساری کسمساہٹیں چھن گئیں لیکن اسکی بنیاد دبی رہی۔ بنیادی طور پر کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ عبرانی پر اگرچہ

عوام کی زبان رکھی گئی تھی جو مقبول تھی لیکن اسکے باوجود بنیادی طور پر اس زبان میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ یہ اور بات ہے کہ اسکے الفاظ بدل گئے۔ چھین لئے گئے۔ اس زبان کے خوبصورت اور انوکھے محاورے اور تشبیہیں ختم ہوگئیں لیکن وہ زبان اپنی انفرادیت کے ساتھ زندہ رہی اور بنیادی طور پر کسی قسم کا کوئی فرق نمایاں نہیں ہوا۔ تعلیم، عقل اور سماجی زندگی کے نئے انداز اسکا تقاضہ ہمیشہ کرتے رہتے ہیں کہ زبان نئے الفاظ کو اپنے حلقہ میں لیتی رہے۔ لفظوں کا اضافہ کرتی رہے۔ زبان اس تقاضہ کو پورا کرتی ہے اور اس طرح قواعد میں بھی نئی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ اور نئی باتیں ہوتی رہتی ہے۔ اسٹالن نے درست کہا تھا کہ الفاظ کے ذخیرہ میں جتنا اضافہ ہوتا رہتا ہے زبان اسی قدر آگے بڑھتی رہتی ہے یعنی اسی حساب سے آگے بڑھتی ہے۔ صرف الفاظ کا جمع کرنا کوئی زبان نہیں بن جاتا۔ الفاظ بکھرے ہوئے موتی ہیرے اور جواہرات ہیں۔ انہیں اکٹھا کر کے ایک خوبصورت ہار کا بن جانا ہی زبان کا بنتا ہے۔ الفاظ زبان کو بنانے اور نکھارنے کے سامان ہیں بالکل اسی طرح جس طرح گھر بنانے کے سامان ہوتے ہیں۔ زبان کے قواعد ان الفاظ سے جملوں کی تعمیر کرتے ہیں۔ جملے تراشتے ہیں۔ اور جملے تخلیق کرتے ہیں۔ قواعد کے قوانین الفاظ کی ترتیب درست کرنے کے بعد زبان کو نئے سانچے دیتے ہیں۔ اور زبان کو نئی صورتیں اور نئے روپ ملتے ہیں۔ قواعد کے نرم اصول لفظوں کو ٹھوس بناتے ہیں۔ اور نئی تبدیلیاں لاتے ہیں۔

زبان ایک سماجی شے ہے جو سوسائٹی کی دھڑکنوں کو اپنے سینے سے لگائے رہتی ہے۔ زبان کی پیدائش اور زبان کا ارتقا سماج کی پیدائش اور سماج کے ارتقا کے ساتھ ہوتا ہے۔ کسی خاص سماجی ماحول اور سماجی زندگی کے ساتھ زبان کی زندگی اور موت وابستہ ہوتی ہے۔

سماجی زندگی سے علیحدہ زبان کا کوئی تصور قائم نہیں کیا جا سکتا۔ زبان کے قانون کو سمجھنے کے لئے اس زبان کے بولنے والوں کی تاریخ اور ان کے شعور کے ارتقاء کو سمجھنا نہایت ہی ضروری ہے۔ روزانہ زندگی کے لہو سے زبان کی نبض چلتی ہے اور اسکی سانس میں خوشبو پیدا ہوتی ہے۔ انسان اسکی مدد سے فطرت کی تسخیر کرتا ہے۔ اس لئے کہ زبان انسان کے تجربوں کو جنون عطا کرتا ہے۔ ایک تڑپ اور ایک خاص قسم کی بیچینی مادی زندگی سے حاصل کئے ہوئے تجربوں کو ملتی ہے۔ پھر تجربوں میں وسعت اور گہرائی پیدا ہوتی ہے اور تجربے اپنے نکھار پاتے ہیں۔ کارل مارکس (Karal Marx) اور اینجلس (Engels) نے کہا تھا کہ زبان خیالات کی سچی حقیقت کا نام ہے۔ اور یہی دراصل وہ شعور ہے جس میں عمل کرنے کی لگن پیدا ہوتی ہے۔ مارکس نے تو یہ بات اور زیادہ صاف طور پر کہہ دی ہے کہ خیالات زبان سے علیحدہ رہ کر زندہ نہیں رہ سکتے۔ تصورات کی کوئی تصویر زبان سے الگ رہ کر نہیں بن سکتی

کوئی زبان اچانک نہیں مرجاتی اور نہ اسکی جگہ کوئی دوسری زبان اچانک پیدا ہو جاتی ہے۔ زبان کی خاص چیزیں اس زبان کے قوانین اور قواعد ہوتی ہیں۔ اور عوام کے گہرے رشتے اور الفاظ کے حسین ذخیرے ہوتے ہیں۔ یہ چیزیں جب تک زبان کے ساتھ ہیں زبان کی موت ناممکن ہے۔ اچانک نہ تو کبھی کوئی زبان پیدا ہوئی اور نہ کوئی ختم ہوئی۔ اسلئے کہ عوام کے رشتے اچانک قائم نہیں ہوتے۔ عوام اچانک کوئی بات نہیں سوچتے۔ اور اچانک کوئی تاریخ مرتب نہیں کر لیتے۔

کوئی زبان اچانک اسی وقت ختم ہو سکتی ہے جب انسان بھی اچانک بدل جائے

اور ہر کا شعور رات بھر یا ایک نئی صورت اختیار کرے اور ہم جانتے ہیں کہ ایسی بات کبھی نہیں ہوتی۔ زبان کو ایک دو سال یا پانچ دس سال کے اندر ختم کر دینے کی کوشش مضحکہ خیز ہے۔ اس سے فضا بھی خاموش نہیں رہ سکتی سماجی زندگی میں ہنگامے ابل آئیں گے۔ کسی حکومت کے بدل جانے سے یا کسی نظام کی تبدیلی سے زبان کی بنیادیں نہیں بدل جاتی ہیں

زبان کا تعلق عوام سے ہمیشہ رہا ہے۔ زبان عوام کی تخلیق ہوتی ہے قوموں کی تاریخ ، سماجی رد و بدل ، اور انسان کی نفسیات کا بھی اس میں زبردست ہاتھ رہا ہے۔ عوام سے مراد کوئی خاص طبقہ نہیں ہے بلکہ وہ سارے لوگ مراد ہیں جو کوئی زبان بولتے اور لکھتے ہیں۔ زبان کے ارتقا میں عام و خواص دونوں کی محنت شامل رہتی ہے۔ انسان جو زبانیں ہمیشہ بولتا ہے وہ اپنی پیدائش کے ساتھ اپنے دماغ میں محفوظ کر کے نہیں لاتا۔ اور نہ انسان کے جسم کے اندر کوئی کیڑا ہوتا ہے جو زبان اور بولیوں کی پرورش کرتا۔ اور بڑا بناتا ہے۔ انسان کی زبانیں اور بولیاں سیاسی سماجی اور جغرافیائی حادثوں پر منحصر کرتی ہیں۔ یہی حادثے زبانوں اور بولیوں کو جوان کرتے ہیں۔ اور بعض وقت یہی حادثے انہیں ضعیف بنا کر مفلوج بھی کر دیتے ہیں۔ انسان کی سیاسی اور سماجی جد و جہد سے زبان بنتی ہے اور ترقی کرتی رہتی ہے۔ سماجی جد و جہد کی کمزوریاں یا طاقتیں زبان کی موت کی بھی باعث بنتی ہیں۔ روٹی کی جد و جہد ، جنگ ، شادی ، موت ہنسی ، خوشی ، غم ، حسد ، محبت ، نفرت ، خودداری ، اخلاق ، طنز و مزاح اور مختلف عناصر انسان کی زبان میں نئی لہک پیدا کرتے ہیں اور بعض وقت زبان کی رگوں سے لہو نچوڑ لیتے ہیں۔ روز روز کے ہنگامے جو سماج میں ہوتے رہتے ہیں۔ زبان میں نئے الفاظ ، نئے محاورے ، نئی اشاریت ، نئی تشبیہیں

نئے خیالات، نئے جملے اور نئی آوازوں کا اضافہ کرتے ہیں۔ زبان کسی ایک فرد کی جائداد نہیں ہوتی۔ یہ عوام کی ملکیت ہوتی ہے جو سماجی، سیاسی اور جغرافیائی حادثوں سے جنم لیتی ہے۔ زبان انسان کی قوت ہے۔ فطرت سے جنگ کرنے میں جتنی مدد اس قوت سے ملتی ہے اتنی مدد اسے اپنی دوسری قوت سے نہیں ملتی۔ زبان انسانی تعلقات اور سماجی حقیقتوں کی سچائی کا ثبوت ہے۔ اسی ایک ثبوت سے انسانی تعلقات اور سماجی حقیقتوں پر ایمان لانا پڑتا ہے۔

ہندوستان کی قدیم تہذیب مصر، میسوپوٹیمیا اور یونان کی قدیم تہذیبوں سے مختلف ہے۔ قدیم ہندوستانی تہذیب کا ایک سلسلہ ہے جو لوٹتا نظر نہیں آتا۔ مغرب کے مصنفین نے بھی اسکا اقرار کیا ہے کہ قدیم ہندوستانی تہذیب کی سب سے پیاری بات یہ ہے کہ اسمیں انسانیت ہے۔ انسان دوستی ہے۔ محبت ہے اور شرافت ہے۔ قدیم ہندوستانیوں نے زندگی کی لطافتوں کو اپنایا۔ ان سے لطف اندوز ہوئے۔ مادی حقیقتوں سے نفرت نہیں کی۔ ہندوستان کی قدیم تاریخ کی ترتیب میں جن عناصر کا ہاتھ رہا ہے ان میں ہندوستان کے پہاڑوں، دریاؤں اور سمندروں کی بھی اپنی جگہ ہے دریاؤں کو مقدس سمجھا گیا۔ انہیں "ماں" کہا گیا۔ پہاڑوں کو امن کا مجاہد بتایا گیا۔ یہ حقیقت ہے کہ ان کے بغیر قدیم ہندوستانیوں کی زندگی میں حیات کے سچے نقوش شامل نہیں ہو سکتے تھے۔ ان پہاڑوں اور دریاؤں نے ان کی زندگی کی حفاظت کی ہے۔ قدیم پتھر کے زمانہ میں ہندوستانی شکار اور جنگلی غذاؤں پر زندہ رہتے تھے۔ ان کے ہتھیار پتھر کے تھے۔ اور وہ ہڈیوں اور لکڑیوں کے بھی ہتھیار بناتے تھے۔ ان لوگوں کے آثار اور انکی یادگار چھوڑے [illegible] زمانہ کی ہڈیوں کے ہتھیار پائے [illegible]

اور شمالی ہندوستان میں بھی اس قسم کے ملتے جلتے ہتھیار کارلائل، بروس فٹ اور دوسرے ماہرین نے حاصل کئے ہیں۔ دوسرے دور یعنی نئے پتھر کے دور میں ان لوگوں نے پتھروں سے خوب کام لیا۔ پتھروں کو مختلف ڈھنگ سے تراشا اور ان سے ہتھیار بھی بنائے اور اپنے رہنے کے لئے ننھے ننھے مکان بھی۔ آگ کی دریافت ہوئی۔ برتن بنائے گئے اور کھانا بنانے کے نئے ڈھنگ معلوم ہوئے زمین سے اناج بھی پیدا کیا۔ سونے کے زیورات کا بھی اس دور میں پتہ چلتا ہے ان لوگوں نے مُردوں کو دفن بھی کیا۔ اور پتھروں سے خوبصورت قبریں بھی تیار کیں۔ کوک بران مرزا پور میں اس قسم کی قبروں کے پتھر دریافت کئے ہیں۔ جنوبی ہندوستان میں بھی ایسی کچھ قبریں پائی گئی ہیں جن میں اس زمانہ کے پتھر اور لوہے موجود ہیں۔ ان دونوں دور کے حالات نے ہندوستان کی تاریخ اور کلچر پر اچھی روشنی ڈالی ہے۔ قدیم تاریخی حقیقتوں کے بعض اہم مسئلوں کو سلجھانے کے لئے ان دونوں دور پر نظر ضروری ہے۔ لوہے کے دور میں لوگوں نے پتھر کی جگہ لوہے سے کام لیا۔ ان لوگوں کے ہتھیار لوہے کے ہوتے تھے۔ کول، بھیل، سنتھال، منڈا اور اڑاؤں آج کل انہی لوگوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جنوبی اور شمالی ہندوستان کے جنگلوں میں بھی ابھی ایسے قبیلے موجود ہیں جو لوہے کے دور کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کی عبادت کا طریقہ بھی نہایت ہی قدیم ہے اور ان کی زبان بھی انڈو آرین زبانوں سے الگ ہے۔ شکار کھیلنے کے طریقوں اور ہتھیار تیار کرنے کے طریقوں میں بہت کچھ تبدیلیاں آگئی ہیں۔ لیکن رہنے سہنے کے ڈھنگ اور پہاڑوں اور جنگلوں میں کاشت کے طریقے وہی ہیں جو لوہے کے دور میں تھے۔ آریوں کے قبل دراوڑی قومیں بھی آباد تھیں۔ آج کل ان کی نمائندگی تامل، تیلگو اور کنڑا زبان کے لوگ

دالے کر رہے ہیں۔ بلوچستان کے قبیلوں میں ایک قبیلہ براہیس (Brahuis) ہے جو تامل اور تیلگو سے ملی جلی زبان بولتا ہے۔ کچھ ماہرین یہ کہتے ہیں۔ کہ دراوڑین مغربی ایشیا سے ہندوستان آئے تھے۔ اور بلوچستان میں اپنے اثرات چھوڑ گئے تھے۔ دراوڑی قوموں کی تہذیب میں عجیب نکھار تھا بہت سارے دوسرے علاقے اس سے متاثر ہوئے۔ دراوڑی قوموں نے جنوبی ہندوستان میں ایک نہایت ہی اعلیٰ تہذیب پھیلا رکھی تھی۔ ویدک اور کلاسکی سنسکرت پر ان کے اثرات گہرے ہیں۔ منگول خاندان کے لوگ بھی چین سے ہندوستان آئے تھے۔ یہ لوگ زیادہ تر تبت کے راستوں سے برہم پتر تک آئے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ برما کے راستوں سے میکونگ آئے۔ ان کی نسلوں کے لوگ ابھی تک نیپال، بھوٹان، سکم، منی پور اور دوسری جگہوں پر آباد ہیں۔ برما میں ان لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے سنتھالی، کھاسی منڈاری، نکوباری، تامل، تیلگو، ملیالم، تو تو، کنڑی، آسامی اور نیپالی زبانوں اور بولیوں کے تجزیہ کے وقت تاریخ کی ان حقیقتوں پر گہری نظر رکھنا ہو گی۔ بلوچستان، سندھ، گجرات اور جنوبی ہندوستان میں جو نہایت ہی قدیم پتھر کے ہتھیار اور کلہاڑیاں پائی گئی ہیں ان سے قدیم ہندوستانی کلچر کو سمجھنے میں بہت آسانی ہوتی ہے۔ قدیم عناصر سے اسکا پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کی زمین پر سب سے پہلے قدیم انسان نے تن کر چلنا سیکھا تھا۔ وہ ہاتھ سے کوئی سہارا لئے بغیر کھڑا ہو سکتا تھا۔ قدیم نوادر سے ہمیں اسکا علم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی قدیم زندگی میں جینے کے طریقے کیا تھے [illegible] کی تبدیلیوں کو انسان دیکھ سکتا تھا۔ شکار کے لئے مختلف [illegible] ہوتی تھیں۔ یہ [illegible] زندگی کے [illegible]

یہ ضرور ہے کہ جد و جہد میں تیزی نہیں تھی۔ زندگی آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ کائنات کے اسرار و رموز کھل کر سامنے نہیں آ گئے تھے۔ رفتہ رفتہ زندگی میں تبدیلیاں آتی گئیں۔ اور قدیم ہندوستانی جانور پالنے لگے کتوں سے شکار میں مدد لی گئی۔ پھر ایک وقت تھا جب کہ انسان نے شکار کے پیچھے دوڑنا کم کر دیا۔ جانوروں کو پالنے کے بعد ان کے گوشت کھایئے یعنی اپنا شکار گھر پر رکھا۔ جانوروں کو قریب کرنے کے لئے اناج پیدا کیا گیا۔ ماحول کی حقیقتوں کو بہت کچھ سمجھا گیا۔ خوف دور ہوا۔ بیج ڈالنے کے بعد اناج کے انتظار کے لئے انہیں ایک جگہ ٹھہرنا پڑا۔ اور اس کے واسطے انہیں مکان بنانا پڑا۔ مکان کے بعد خاندان کی اہمیت کا گہرا احساس ہوا۔ قدیم ہندوستانی چین کے قبل ہندوستان میں چاول پیدا کر چکے تھے۔ برتنوں پر ان کی نقاشی میں ان کی زندگی کی جھلکیاں موجود ہیں۔ ان کے رنگوں کے انتخاب میں ان کی زندگی کا سکون اطمینان، جد و جہد کا ڈھنگ، مختلف عناصر کی ترتیب اور بہت ساری باتوں کا علم ہو جاتا ہے۔ سُرخ، سبز، زرد اور نارنجی رنگوں کا انہیں علم تھا۔ قدیم ہندوستانیوں کی زندگی میں ان ساری باتوں سے ایک انقلاب آ گیا تھا۔ زمدا اور سابرمتی کی وادیاں قدیم ہندوستانیوں کی تہذیب کو سینے سے لگائے ہوئی تھیں۔ ان وادیوں میں قدیم زندگی کی تلاش جاری ہے۔ یہ وادیاں ہمیں بہت ساری چیزوں کے انتظار کو کو ختم کرتی ہیں۔

ہماری تاریخ میں انڈس ویلی کلچر (3500 B.C.) کی بھی بہت اہمیت ہے۔ اس تہذیب و تمدن کا پتہ بھی بہت بعد میں یعنی 1926ء

ہیں جو تحقیقات ہوئی تھیں ان سے پتہ چلا تھا کہ تین ہزار سال قبل مسیح ہندوستان کی مغربی سرحد پر بلوچستان کے قریب ایک کلچر تھا۔ اس کلچر کی جو چیزیں دریافت کی گئیں ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اسوقت ہندوستان میں ایک ترقی یافتہ تمدن تھا۔ ہڑپا (پنجاب) اور موہنجو دارو (سندھ) کی چیزوں میں بہت مماثلت ہے۔ پانچ ہزار سال قبل مسیح موہنجو دارو میں ایک خوبصورت شہر آباد تھا۔ جو مکانات بنائے گئے تھے۔ وہ اینٹ اور مٹی کے تھے۔ خوبصورت سڑکیں تھیں۔ ہر مکان میں ایک غسل خانہ تھا۔ پبلک بلڈنگ اور بڑے بڑے ہال تھے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کے لوگ ایک اچھی سماجی اور سیاسی زندگی گذار رہے تھے ان لوگوں کے متعلق یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ وہ لوگ تین شکل والے دیوتا (جو ایک جوگی کی طرح بیٹھا ہے) پوجا کرتے تھے۔ ماہرین کہتے ہیں کہ وہ شیو کی کوئی صورت تھی۔ جانوروں کی بھی پرستش ہوتی تھی۔ درختوں اور آفتاب کی عبادت کرتے تھے۔ ایک دیوتا ایسا بھی تھا جو نصف انسان اور نصف دیوتا تھا۔ اسکی بھی پرستش خوب ہوتی تھی۔ ہاتھی دانت کے زیورات پائے گئے ہیں۔ روئی اور اون کے قیمتی کپڑے تیار کئے جاتے تھے۔ موہنجو دارو میں خوبصورت مندریں بھی شکستہ حالتوں میں پائی گئی ہیں، تیر، کمان، کلہاڑی اور بھالے ان کے خاص ہتھیار تھے۔ یہی ہتھیار رگ وید کے آریوں کے پاس بھی تھے۔ اسلئے کہ ان کا ذکر صاف طور پر رگ وید میں ملتا ہے انڈس ویلی میں بچوں کے کھیلوں کے مختلف طریقے بھی تھے۔ اور کھلونے بھی بنائے جاتے تھے۔ ان کے رسم الخط کے متعلق بعض ماہرین یہ کہتے ہیں کہ وہ سنسکرت کی بنیاد ہے۔

انڈس ویلی تہذیب سے انسانی زندگی اور قدیم ماحول کی جو مکمل تصویر ملتی ہے اس سے بہت سارے اسرار و رموز کھلتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس قدیم ماحول کا مطالعہ اور اچھی طرح ہو۔ قدیم زندگی کا یہ پہلو صبر اور تحمل کا مطالبہ کرتا ہے تاکہ تحقیقات سے جو باتیں سامنے آئیں ان کی صداقت سے اور بہت سارے پہلو اجاگر ہوں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس تہذیب کے جو آثار ہمارے سامنے موجود ہیں وہ ایک ایسے کلچر کا پتہ دیتے ہیں جو ہزاروں برس میں ایک ایسے اعلیٰ مقام تک آئے ہونگے۔ اس تہذیب میں ثقافتی ترقی دیکھکر حیرت ہوتی ہے۔ اس وقت کے لوگوں کے تعلقات دوسرے ملکوں سے گہرے تھے۔ مہنجوداڑو سے بہت ساری چیزیں باہر جاتی تھیں۔ مچھلیاں تو خاص طور پر دوسرے ملکوں میں بھیجی جاتی تھیں۔ سمری لوگوں سے انکے تعلقات اچھے تھے۔ اکڈ میں مہنجوداڑوں کے تاجروں نے ایک ہندوستانی ادارہ قائم کرلیا تھا۔ تگرس کے بازاروں میں ہندوستانی سامان فروخت ہوتے تھے۔ ان کے کلچر کا اثر سمیرین کلچر پر اچھی طرح ہوا ہے۔ فارس، موہنجوداڑو اور مصر سے ان کے تعلقات کا صاف پتہ چلتا ہے۔ اس قدیم سماج میں تاجروں کا طبقہ دولت مند تھا۔ شہروں میں چھوٹی چھوٹی بہت سی دکانیں تھیں دکانوں کو بہت پیارے ڈھنگ سے سجایا جاتا تھا۔ کچھ ماہرین قدیم سمری تہذیب کے عناصر کو مہنجوداڑو کی تہذیب میں تلاش کرتے ہیں۔ وہ ماہرین نہ جانے اس بات پر کیوں نہیں غور کرتے کہ براہوی زبان اور دراوڑی زبان میں مماثلت ہے، لیکن دراوڑی اور سمیری زبانوں میں کسی قسم کی مماثلت نہیں ہے رگ وید میں جہاں اسکا بیان ہے کہ آریوں کے وقت میں بھی غیر آریہ خوبصورت

اور اچھے شہروں اور مضبوط مکانوں میں رہتے تھے۔ وہاں بعض ماہرین کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ غیر آریہ مہنجو دارو کے لوگ تھے۔ رگ وید میں اس سلسلہ میں باتیں صاف نہیں ہیں۔ جو اشارے ملتے ہیں وہ شاعرانہ اصلاحوں میں ہیں۔ ہڑپا اور مہنجو دارو کے آثار سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مہنجو دارو کو زیادہ اچھی طرح بسایا گیا تھا۔ اور اس کے لئے کوئی خاص پلان تھا۔ وہاں کی سڑکیں بالکل سیدھی تھیں اور کافی چوڑی بھی۔ مکانوں کے علاوہ غسل کرنے کی ایک بہت بڑی جگہ بھی نظر آتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید سال میں کوئی ایسا تہوار ہوتا تھا جس میں سارے لوگ اس جگہ جمع ہو کر ایک ساتھ غسل کیا کرتے تھے۔ ہڑپا کلچر میں چھوٹے شہر اور گاؤں کے بھی آثار ملتے ہیں مندروں کی تعمیر ہمیشہ ایک قسم کی ہوئی۔ کچھ بھی فرق نہ آیا۔ مندروں کی تعمیر کی اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ اس تہذیب میں مذہبی نظریوں میں کوئی خاص تبدیلی کبھی نہیں آئی تھی۔ ایسے بادشاہوں کی حکومت کا بھی پتہ چلتا ہے جو عمر بھر پجاریوں کی زندگی بسر کرتے رہے۔ اس وقت کے لوگوں کی خاص غذا میں دودھ، مچھلی، گیہوں، اور جو کی روٹی اور مختلف قسم کی سبزیاں شامل تھیں۔ سانڈ، گائے، بھینس، بھیڑ، گدھا، ہاتھی، اونٹ، گھوڑا، کتا بلی اور دوسرے بہت سارے جانور پالے جاتے تھے۔ مہنجو دارو میں ایک ایسی اینٹ ملی ہے جس پر ایک کتے اور ایک بلی کے پاؤں کے نشانات ہیں جب اینٹ گیلی تھی اسی وقت کوئی کتا کسی بلی کے پیچھے دوڑتے ہوئے اس پر گذر گیا تھا۔ مختلف زینوں پر انسان کی کھوپڑیاں ملی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ غالباً آخیر وقت میں کوئی حملہ ہوا تھا۔ جس سے بچنے کے لئے لوگ بھاگ رہے تھے۔ سیلاب اور آگ لگنے کی بھی شہادتیں ملتی ہیں۔ صوبہ

بہار میں مانجھی کے قریب جوتا بنے کے ہتھیار دستیاب ہوئے ہیں۔ ان سے بعض ماہرین یہ سمجھتے ہیں کہ ہڑپا اور مہنجودارو کے تہذیبی عناصر سے شمالی ہندوستان نے بہت کچھ سیکھا تھا۔

اس کلچر کی زبان سمجھنے سے ہم ابھی تک قاصر ہیں۔ انڈس کے عوام قبروں میں مصریوں کی طرح پتھر پر تحریریں یا پیپرس پر کہانیاں، حکایتیں اور گیت لکھکر نہیں رکھتے تھے۔ ان کی تحریروں کا پتہ ان کی سیلوں کے نقوش سے چلتا ہے۔ ان کے نقش کو پڑھنے کی کوششیں جاری ہیں۔ یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اس بڑی تہذیب کی ابتداء کے متعلق ہمیں کچھ پتہ نہیں۔ اور اس سلسلہ میں کامیابی ابھی ناممکن ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے کہ جس طرح ان کے مذہبی نقطہ نظر میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوئی اسی طرح تہذیب میں رسم الخط میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ انڈس کے عوام کی تاریخ اسکی گواہی دے رہی ہے کہ انہیں اپنا رسم الخط بہت عزیز تھا۔ اور وہ اسے بدلنا نہیں چاہتے تھے۔ حالات کی تبدیلیوں کے ساتھ رسم الخط میں تبدیلیاں نہیں آئیں۔ ان کی زبان میں دو سو ستر الفاظ ملتے ہیں۔ جو بنیادی طور پر تصویری تحریر کے قریب ہیں۔ چنہودارو میں ایک ایسا پیالہ ملا ہے جس سے اسکا اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت کے لوگ روشنائی کا استعمال جانتے تھے۔ تحقیقات سے اس کا پتہ چل گیا ہے۔ کہ اس وقت کے عوام مٹی کی تختیوں پر نہیں لکھتے تھے۔ اگر ایسی بات ہوتی تو کہیں نہ کہیں کوئی تختی ضرور دستیاب ہوتی۔ ان کی زبان کا اپنا ادب بھی تھا۔ جس میں مذہبی خیالات پھیلے ہوئے تھے۔ لیکن ہماری بدقسمتی سے ان کا ادب نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ ہم انہیں شاید کبھی حاصل نہیں کر سکتے۔ سیلوں پر ان کی فنکاری کا بھی پتہ چلتا ہے۔ جانوروں

کی تصویروں میں بڑی جان ہے - وہ تصویریں حقیقی زندگی سے بہت قریب ہیں۔ انسانی تصویروں میں بھی جو حقیقی جھلکیاں ہیں۔ ان میں اسوقت کے لوگوں کی ذہنی بیداری کا پتہ چلتا ہے۔ رقص کرتی ہوئی ایک دوشیزہ کی ننگی تصویر ملی ہے۔ اسمیں اس لڑکی کے خوبصورت بالوں کی ترتیب دیکھکر حیرت ہوتی ہے۔ ممکن ہے اس وقت کی لڑکیاں اسی طرح بال سنوارتی ہوں۔ اس تصویر سے اس کلچر کے جمالیاتی احساس کا علم ہوتا ہے۔ عورت کے حسن کے متعلق جس طرح اسوقت سوچا جاتا تھا۔ اس طرح بعد میں کبھی نہیں سوچا گیا

آریوں کے اصل وطن کے متعلق بہت ساری باتیں کیجاتی ہیں اس سلسلہ میں بہت بھاری رائیں ہیں۔ آریوں کی قدیم تحریروں میں بھی اسکا کوئی صاف جواب نہیں ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ آریہ روسی میدان سے چلے اور عراق آئے۔ اور پھر ایران اور ہندوستان۔ ایران پہنچکر مختلف قبیلوں میں تقسیم ہو گئے۔ اور یہی قبیلے کچھ کچھ عرصہ بعد ہندوستان آتے رہے۔ میں اپنے طور پر اس خیال کو غلط سمجھتا ہوں۔ چونکہ ایرانی اور ہندوستانی آریوں کی بہت ساری باتیں ایک تھیں اس لئے ایسی باتیں کی جاتی ہیں۔ آگے چل کر میں اسکے متعلق اپنے خیال کا اظہار کروں گا۔ یہ ضرور ہے کہ دونوں جگہوں کے آریہ قریب قریب ایک سی زبان بولتے تھے۔ ایک ہی طرح کے دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے۔ ان کے مذہبی گیت بھی قریب قریب ایک تھے۔ اور سماجی طور پر جد وجہد کرنے کا انداز بھی ایک ہی تھا۔ رگ وید میں آریوں اور ملک کے قبائلیوں کی متواتر لڑائیوں کا حال درج ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہے کہ آریہ باہر سے آئے تھے۔ رگ وید میں ہندوستانی آریوں کے بھجن اور گیت

ہیں۔ گریرسن کا یہ خیال بھی غور و فکر کی دعوت دیتا ہے کہ رگ وید کے دو بھجن اور گیت جو بہت قدیم ہیں ہندوستان میں آریوں کے آنے کے قبل لکھے گئے تھے۔ اس سلسلہ میں بہت سی باتیں مختلف طریقوں سے پیش کیجاتی ہیں رگ وید وہ قدیم تحریری دستاویز ہے جسے ہم سمجھتے ہیں اور جسکی مدد سے قدیم زندگی کا تجزیہ کرتے ہیں۔ ویدک ادب کے مطالعہ کے بغیر آریوں کے کلچر اور روحانی زندگی کو نہیں سمجھا جا سکتا ہے۔ رگ وید کے مطالعہ کے وقت یہ بات بھی ذہن میں رکھنا چاہیئے۔ کہ اس میں صرف ایک ہی دور کے منتر گیت اور بھجن نہیں ہیں بلکہ گذرے ہوئے دلوں کے بھی عناصر جمع ہیں۔ رگ وید میں کئی کلچر کا رنگ ملتا جائے گا۔ اس دور کے کلچر کو چھوڑ کر باقی سارے رنگ نہایت ہی قدیم کلچر کے ہیں۔ اس طرح رگ وید کے زمانہ کے قبل کی فضا بھی سامنے آجاتی ہے۔ رگ وید میں قدیم عناصر بھی ہیں اور جدید بھی۔ اسکے مطالعہ سے جہاں اور بہت ساری باتیں معلوم ہوتی ہیں وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رگ وید کی تخلیق کے وقت آریہ ہندوستان کے ہر گوشہ میں نہیں پھیلے تھے۔ پنجاب کی زمین ان کا وطن بن گیا تھا۔ "پانچ ندیوں والی زمین" کا ذکر ملتا ہے۔ رگ وید کے گیتوں میں "کالے چمڑے والوں" اور آریوں کی لڑائی کی باتیں ہیں۔ اس قوم کو داسا کہا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس جنگ کی بنیاد یہی تھی کہ آریہ غیر آریہ کو اور غیر آریہ آریہ کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ داسا قوم کے دیوتا نہیں تھے۔ انکا کوئی قانون نہیں تھا اور قربانی کے کوئی خاص طریقے نہیں تھے۔ آریوں کے حملوں سے گھبرا کر داسا یورپ کیطرف بھاگے اور گنگا کی وادی میں پناہ لی۔ رگ وید کے بعض منتروں اور گیتوں سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کی تخلیق پنجاب میں ہوئی تھی۔ رگ وید کے منتروں گیتوں

اور بھجنوں میں کنول کے پھول کا ذکر نہیں ہے۔ شیر کا بھی ذکر نہیں ہے
اس سے ظاہر ہے کہ آریہ اس وقت ہندوستان کے ہر گوشہ میں نہیں پھیلے
تھے۔ بنگال کی زمین جو شیروں کی زمین تھی وہاں ان کی پہنچ نہیں تھی
کنول کے پھول جو بعد میں شاعروں کا ایک اہم موضوع اور ایک نازک تشبیہہ بن
گیا آریوں سے دور رہا۔ جانوروں کی بہت قدر تھی۔ ان سے آمدنی ہوتی تھی
بیل اور گھوڑے اچھی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ رتھ میں گھوڑے لگائے
جاتے تھے۔ اور جنگ کے میدان میں ان کی چال کی بہت اہمیت تھی۔ گھوڑوں
کی تیز رفتاری کے مقابلے بھی ہوتے تھے۔ رگ وید کے گیتوں اور بھجنوں میں
دیوتاؤں کی عبادت کے وقت جانوروں کے لئے (خاصکر بیلوں اور گھوڑوں کے
لئے) دعائیں مانگی جاتی تھیں اور دیوتاؤں کو بہت آسانی سے اس دائرہ
میں رکھا جاتا تھا جس دائرہ میں بیل، گائے اور گھوڑے رکھے جاتے تھے
بعض دیوتاؤں کا مقابلہ بھی جانوروں سے کیا جاتا تھا۔ جانوروں کی آوازیں
موسیقی کی لہریں ڈھونڈھی جاتی تھیں۔ مقدس گیت گانے والے اندر دیوتا
کو پکارتے تھے تو یہ کہا جاتا تھا کہ ایسا لگتا ہے۔ جیسے گائے اپنی آواز سے اپنے
بچے کو جگا رہی ہے۔ گائے کے دودھ کی قدر و قیمت سماج میں بہت تھی۔ رگ وید
کے گیتوں، بھجنوں اور منتروں کی عظمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں
طنز کا جو انداز ملتا ہے اسکی بھی بہت اہمیت ہے۔ ہندوستان کی سب سے
قدیم تہذیب کی یہ ایک مکمل دستاویز ہے۔ اس کے مطالعہ کے بغیر یہاں کی زبان
کی ابتداء اور ارتقاء کے متعلق کچھ سوچا نہیں جا سکتا۔ آج ماہرین لسانیات
اس بات پر متفق ہیں کہ ایک وقت تھا جب ایرانی اور ویدک آریہ ایک
تھے اور ایک ہی زبان بولتے تھے۔ ان لوگوں کا کلچر ایک تھا۔ اور انکی

سوسائٹی ایک تھی۔ زرتشت کی روحانی تعلیم میں بھی وید کی روح بہت حد تک سمائی ہوئی ہے۔ سنسکرت اور یونانی زبان کا تعلق بھی جتنا گہرا معلوم ہوتا ہے۔ اسے دیکھکر حیرت ہوتی ہے۔ یہ خیال بھی مستحکم ہو جاتا ہے کہ دونوں کی بنیاد میں مماثلت ہے۔ سنسکرت اور تمام انڈو یورپین زبانوں اور بولیوں کا تعلق گہرا ہے اس طرح ان کے تعلق کے متعلق بھی بہت کچھ سوچا گیا ہے۔ سنسکرت کا لفظ آبھارن (A' bharan) یونانی لفظ ای فیرون (e' pheron) سے بہت قریب ہے۔ اس طرح اور بھی بہت سارے الفاظ ہیں۔ ہر یونانی ای (e) کے لئے سنسکرت میں ایک "آ" (ā) ہے اور ہر سنسکرت بھ (bh) کے لئے یونانی میں ایک "پھ" (ph) حال ہی میں تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ انڈو یوروپین قبیلوں کی تاریخ میں ایسی قومیں بھی ہیں جن کے وطن کا علم ابھی تک کسی کو نہیں ہے لیکن ان قوموں کے اور بہت سارے حالات کا علم ہو گیا ہے ہی ٹائیٹس (Hittites) کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ یہ لوگ قدیم ہند ایرانی اور قدیم یونانی کے درمیان ایک کڑی تھے۔ اور ان لوگوں کی زبان انڈو یوروپین بولی کی غالباً پہلی صورت ہے۔ ہی ٹائٹس کے معنی جو بھی ہوں۔ یہ ضرور ہے کہ یہ اس ہی ٹائیٹ قوم کی زبان نہیں ہے۔ جس کا ذکر بائیبل میں آیا ہے۔ دو ہزار سال قبل مسیح ہی ٹائیٹس نے اناطولیا پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور نیساس (Nesas) قوم سے لڑائیاں کی تھیں۔ دونوں کے ملاپ سے دونوں کی زبانوں پر گہرا اثر ہوا تھا۔

دراوڑی تہذیب بھی کافی نکھری ہوئی تہذیب تھی۔ دراوڑی قوم میں سمجھ داری اور سمجھ بوجھ بڑھی ہوئی تھی۔ وہ ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ انصاف اور محبت کو سمجھتے تھے۔ ان کے بادشاہ مضبوط مرکانوں میں

رہتے تھے۔ کچھ چنے ہوئے لوگ ہوتے تھے جو تہواروں پر گیت گاتے تھے۔
انہیں دیوتاؤں پر بھروسہ اور یقین تھا۔ خدا کو وہ لوگ "کو" (Ko) کہتے
تھے۔ اپنے خدا کے لئے جو مندر بناتے تھے اسے وہ لوگ "کو ال" (Ko-il)
یعنی خدا کا گھر کہتے تھے۔ ان کے اپنے قانون تھے۔ اپنے رسم و رواج تھے لیکن
ان میں کوئی وکیل اور جج نہیں تھا۔ شادیاں ہوتی تھیں۔ اور شادیوں کے
طریقے نہایت دلچسپ تھے۔ انہیں ٹین اور سیسہ اور بعض دوسری اشیاء کا
علم تھا۔ وہ کشتی اور جہاز بھی بناتے تھے۔ دوائیاں تیار کرتے تھے۔ دو چار ممالک
کے علاوہ ان کا اور دوسرے ملکوں کے عوام سے گہرا تعلق نہیں تھا۔ وہ کھیتی
میں ہوشیار تھے۔ اور جنگ کے ان کے اپنے طریقے تھے۔ تیر، کمان، تلوار اور
بھالے ان کے ہتھیار تھے۔ وہ برتن بنانا خوب جانتے تھے۔ یونان کے جغرافیہ
دانوں نے اپنی کتابوں میں ان کی زبان اور ان کے رہن سہن کے طریقوں پر بھی
روشنی نہیں ڈالی ہے۔ یہ کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا کہ یونان کے جغرافیہ دان
اور تاجر دراوڑی تہذیب سے بہت متاثر تھے۔ لیکن اس تہذیب کا ذکر
شعوری طور پر کہیں بھی کرنا نہیں چاہتے تھے۔ یوں وہ اس وقت کے ہندوستان
کے شہروں اور گاؤں کا ذکر صاف طور پر کرتے ہیں۔ ان کی کتابوں میں اس
سلسلہ میں جو کچھ ملتا ہے وہ دلچسپی سے خالی نہیں ... یونانی تاجروں کے آنے
کے قبل اور ان کے آنے کے بعد بہت ساری باتیں ان جغرافیہ دانوں کی کتابوں
میں ملتی ہیں۔ یونان کے جغرافیہ دان پٹولیمی (Ptolemy) کی کتابوں میں
قدیم دراوڑی الفاظ کے جتنے ذخیرے موجود ہیں اتنے ہندوستان کے باہر کسی بھی
ملک میں ہندوستان کے اتنے الفاظ نہیں ہیں۔ پٹولیمی کے علاوہ پلینی کی کتاب
"نیچرل تاریخ" میں بھی قدیم دراوڑی الفاظ بھرے ہوئے ہیں۔ پلینی بھی یونان کا

ایک مشہور عالم تھا۔ مثال کے لئے دیکھئے:۔

o'Πaνδζων

ہو پنڈین

ηxωρa Πaνδzoων

ہی چوراپنڈیون

سنسکرت سے پانڈو کا لفظ دراوڑی زبانوں میں آیا۔ اور پھر کس صورت سے یونان پہنچا اسکی یہ اچھی مثال ہے۔ یونانیوں کے یہاں "متھرا" کی صورت یہ ہے:۔ **Mă θρa**

اور سنسکرت کا لفظ "چھولا" ان کے نزدیک آکر "سویا" (ςωρa) بن گیا "سورا" کا "ر" تامل زبان میں عجیب آواز پیدا کرتا ہے۔ یہ آواز تلگو میں نہیں ہے تلگو میں اس "ر" کی صورت "ڈ" کی ہے۔ سنسکرت اور پالی میں بھی یہ "ر" "ڈ" ہی ہے یونان میں "ر" اور "ڈ" کی جگہ "پ" نے لے لی۔ چاول کو تامل میں "ارسی" کہتے ہیں یہ لفظ یونان میں اروزہ (opυζa) ہوگیا۔ اسکے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب ہندوستان کا چاول پہلی بار باہر گیا تو اس وقت وہ اپنا نام بھی ہندوستان سے باہر لے گیا۔ ملیالم میں یہی لفظ "آری" بن گیا ہے جو غلط ہے۔ "آری" "ارسی" کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ دراوڑی زبانیں سنسکرت سے نکلی ہیں، انہیں شاید اسکی خبر نہیں ہے کہ دراوڑی خاندان میں ایسی زبانیں بھی تھیں جو ترقی یافتہ نہیں تھیں۔ یا جن کی تراش وخراش نہیں ہوئی تھی۔ دراوڑی خاندان میں یہ زبانیں ہمیشہ زندہ رہی ہیں۔ ان زبانوں میں کہیں کہیں سنسکرت کے الفاظ ضرور مل جاتے ہیں لیکن ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ یہ ماہرین لسانیات اس بات پر غور نہیں کرتے کہ وہ دراوڑی زبانیں

جو سنسکرت کے متعلق الفاظ سے فائدہ اٹھاتی ہیں وہ ان مشتق الفاظ کو الگ بھی کر دیتی ہیں۔ یہ مشتق الفاظ ان زبانوں کے لئے ضروری نہیں ہیں۔ یہ زبانیں سنسکرت کے مشتق لفظوں کو صرف نکھار اور سجاوٹ کے لئے لیتی ہیں۔

اب تمیگو زبان سے اگر سنسکرت کے الفاظ الگ کئے جائیں تو یہ ممکن نہیں ہے۔ کناڑی اور ملیالم کے ساتھ بھی یہی بات ہے۔ ان زبانوں پر سنسکرت کے گہرے اثرات ہیں۔ یہ زبانیں لاکھ کوششوں کے باوجود سنسکرت سے الگ نہیں ہو سکتی ہیں۔ تامل ہی ایک ایسی زبان ہے جو دراوڑی ضرب المثل اور دراوڑی خاندان کی بہت ساری نعمتوں سے مالا مال ہے اور یہ زبان سنسکرت کی مدد کے بغیر بھی آگے بڑھ سکتی ہے۔ اور پھیل سکتی ہے۔ تامل زبان سنسکرت زبان کے الفاظ کو سجاوٹ کے لئے ضرور لیتی ہے لیکن سنسکرت کے الفاظ کو اپنی انفرادیت اور اپنے پھیلاؤ کے لئے بہت آسانی سے چھوڑ بھی سکتی ہے

چار ویدوں کی تخلیق یقیناً ہندوستان میں ہوئی تھی۔ ویدوں سے آریوں کی اس زندگی کا مکمل پتہ چلتا ہے۔ جو ہندوستان کی زندگی تھی رگ وید سب سے قدیم وید ہے۔ اس سے سیاسی، سماجی اور مذہبی زندگی کا مکمل حال معلوم ہوتا ہے۔ اور پنجاب کی زندگی زیادہ صاف طور پر سامنے آتی ہے۔ رگ وید کے متعلق میکس مولر (Max Muller) کا خیال ہے کہ ۱۲۰۰ سال قبل مسیح اسکی تخلیق ہوئی تھی۔ ڈاکٹر ونٹرنٹز (winter nitz) نے اس خیال کی تردید کی ہے۔ اور کہا ہے کہ اسکی تخلیق ۳۰۰۰ سال قبل مسیح ہوئی تھی۔ رگ وید آریوں نے قبیلوں کی زندگی گذاری۔ ایک قبیلہ میں کئی خاندان تھے۔ عمر رسیدہ آدمی اپنے خاندان کا سردار ہوتا تھا اور اسے خاندان والے "پتری" "حفاظت کرنیوالا" — سنسکرت لفظ "پا" ۹۱ پر بھی غور کیجئے) کہتے تھے

خاندان کی عبادت کی ذمہ داری بھی اسی پر ہوتی تھی۔ شادی، جھگڑے اور جائداد کے متعلق اس کا فیصلہ قریب قریب سب کچھ ہوتا تھا۔ ہر قبیلہ کا ایک راجہ ہوتا تھا بعض راجے خاندانی ہوتے تھے۔ اور بعض راجاؤں کا انتخاب کیا جاتا تھا۔ جنگ میں قبیلہ کی نمایندگی کرنیکی صلاحیت میں خاص طور پر دیکھی جاتی تھی۔ قبیلوں کی آپس کی لڑائیاں بھی اہم ہوتی تھیں۔ ان کی اپنی زبان تھی اور خاص سماجی اور مذہبی رسومات اور اصول تھے۔ ان لوگوں نے جنگلوں میں خوبصورت گاؤں اور شہر بسائے۔ آریہ گھوڑوں کو جنگ میں زیادہ استعمال کرتے تھے۔ تلوار، کلہاڑی، تیر اور کمان سے وہ میدان جیت لیتے تھے۔ بزرگوں کی دعاؤں کی بہت اہمیت سمجھی جاتی تھی۔ اس لیے جنگ کے میدانوں میں بزرگ بھی جاتے تھے۔ تاکہ وہ کامیابی کے لئے ہر لمحہ دعائیں کرتے رہیں تیروں میں زہر بھی ڈالے جاتے تھے۔ آریوں نے ہندوستان کو ایک عظیم کلچر بھی دیا ہے۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا ہے۔ آریوں نے ہمیں ایک زبان دی ہے اور ایک ایسا مذہب دیا ہے جو آریوں کے قبل نہیں تھا۔ پنجاب اور سندھ میں ایسے بہت سارے قبیلے تھے جن سے آریوں کو لڑنا پڑا اور ان قبیلوں کو اپنے علاقوں سے بھاگ جانا پڑا۔ رگ وید کے گہرے مطالعہ سے ہم یہ بھی سوچتے ہیں کہ پنجاب اور سندھ کے وہ قبیلے جن سے آریہ نفرت کرتے تھے۔ وہ آریوں ہی کے قبیلے تھے۔ رگ وید وہ قدیم دستاویز ہے جس سے آریوں کی زندگی کی حقیقتیں بہت کچھ معلوم ہوتی ہیں۔ رگ وید کی باتیں صدیوں سینہ بہ سینہ ہیں آریوں کے مذہبی اعتقاد اور عمل کے متعلق رگ وید سے نسبتی باتیں معلوم ہوتی ہیں جہاں تک زبان اور ادبی محاسن کا تعلق ہے۔ رگ وید کا ایک نہایت ہی اعلیٰ مقام ہے۔ ہندوستان کے مذہبی ادب میں رگ وید کی جگہ کوئی

نہیں لے سکتا۔ رگ وید میں آریوں کے دشمنوں کی جو صورت ملتی ہے۔ اس
پر غور کرنا ضروری ہے۔ سیاہ رنگ، چپٹی ناک، سخت زبان، آریوں کے دیوتاؤں
سے باغی۔ انہیں داسا اور آسور (دسیو) کہا گیا ہے۔ رگ وید میں جن دریاؤں کے
نام ملتے ہیں ان میں دی تاستا (جہلم) آسکی (چناب) پارسنی (راوی)،
وپاس (بیاس) اور ساتادرو (ستلج) اہم ہیں۔ کوبھا (کابل) سواستو
(سوات) کرومو (کورام) گومتی (گومل) کے بھی نام ملتے ہیں۔ بعض ماہرین
کہتے ہیں کہ آریوں کو سمندروں کے معجزوں کا علم نہیں تھا۔ یہ ایک بحث
طلب مسئلہ ہے۔ آریہ مختلف قبیلوں میں منقسم تھے۔ پانچ قبیلے اہم تھے۔
(الف) پارس (ب) ترواساس (ج) دری ہوس (د) آبنس (ر)
پلورس۔ ان کے علاوہ قنداریس، پاکھناس، الناس، بھالاناس،
اور سیراس تھے۔ ہر قبیلہ کا راجہ الگ تھا۔ راجہ کا انتخاب کیا جاتا تھا
راجہ ہی فوج کا اعلیٰ افسر ہوتا تھا۔ سبھا اور سمیتی جیسی اسمبلیاں بھی تھیں
اہم مانوں کے قبیلے میں ہوتے تھے دی اوداسا اور سوداسا بہت مشہور
راجے تھے۔ دی اوداسا (جنت کا غلام) بہت بہادر تھا۔ اور آریوں
کے کئی قبیلے اس پر فخر کرتے تھے اس نے داسا کے سردار سمبارا کو شکست
دی تھی۔ بڑے بڑے بیوپاریوں کی آپس میں لڑائیاں بھی اہم رہی ہیں۔ اس
سے کہ ان لڑائیوں سے آریوں کے قبیلوں میں جنگ ہوئی ہے۔ اس راجاؤں کی
عظیم جنگ جو پاروسنی کے کنارے ہوئی تھی اسکی وجہ بھی یہی تھی۔ آریوں
کی زندگی کا انحصار زراعت پر تھا۔ شہری زندگی کی ان کے یہاں کوئی
اہمیت نہیں تھی۔ دیہی زندگی کی نہایت ہی خوبصورت تصویریں رگ وید
میں موجود ہیں۔ خانوادوں سے تجارت کی ایک دنیا آباد تھی۔ موسیقی سے

سے لوگوں کو خاص دلچسپی تھی۔ دینا، داتا (بنسری) اور ڈھول سے
اپنی سرمستیاں بڑھاتے تھے۔ رگ وید میں جو سماج ملتا ہے اس میں طبقے
نظر آتے ہیں۔ حکمران طبقہ، پجاریوں کا طبقہ اور کسانوں کا طبقہ۔ گاؤں
کی سرحد کی تمام ذمہ داری گاؤں کے سردار پر تھی۔ جسے گرامانی کہا جاتا تھا۔
ذات پات کا جھگڑا نہیں تھا۔ رگ وید کے آریہ متحد سماجی زندگی بھی گذارتے
رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں "ویساہ" یعنی عوام کہا جاتا ہے۔ آخری ویدک
دور برہمنوں کے نام ملتے ہیں۔ پرستش کے رسومات کے ساتھ برہمنوں کے
نام نظر آتے ہیں۔ آریوں کی زندگی بہت سادہ اور پیاری تھی۔ سادہ کپڑے
پہنے جاتے تھے۔ سوما جو ایک قسم کی شراب ہوتی تھی اسکا استعمال بھی
خاص طور پر کیا جاتا تھا۔ رتھ کی دوڑ، جوا، موسیقی اور رقص سے لوگ
لطف اندوز ہوتے تھے۔ عورتوں کی عزت بہت تھی۔ گھر کی خاص عورت
یا بیوی کے لئے ایک خاص نام ساھا دھارمنی ملتا ہے۔ جس سے یہ ظاہر
ہوتا ہے کہ سماج میں عورتوں کی عزت بہت زیادہ تھی۔ رگ وید میں عورتیں
سوما (شراب) تیار کرتی تھیں۔ اور قربانیوں میں مردوں کے ساتھ
رہتی تھیں۔ بہت ساری پڑھی لکھی اور باشعور عورتوں کے نام ملتے ہیں
مثلاً وسوادارا، گھوشا، سکتا نزواری وغیرہ۔ ان میں سے بعض عورتوں نے
رگ وید کے بھجنوں اور منتروں کی بھی تخلیق کی ہیں۔ اور ان کا مقام رشیوں
کا ہے۔ نئی دلھن کا سماج میں جو مقام تھا۔ اسکی بھی مختلف تصویریں ملتی
ہیں۔ ایک جگہ ایک نئی دلھن سے دولھا کہتا ہے۔

" ساری دنیا کا خالق ہم لوگوں کو اولاد دے۔ آریہ قوم متحد
رہے۔ ہم دونوں آخری عمر تک وابستہ رہیں۔ اے دلھن، تو ہر

کے گھر میں فخر سے قدم رکھ۔ اس قدم سے ساری انسانیت اور
سارے جانوروں کی زندگی میں چمک آجائے گی"۔ ستی ہونے کا رواج
نہیں تھا۔ بیواؤں کی شادی ہوتی تھی اور لڑکیوں کو باپ کی جائیداد
ملتی تھی۔ نجومی، قربانی کرنے والوں اور منتر پڑھنے والوں کی بھی سماج
میں بہت اہمیت تھی۔ غلاموں کو حاصل کرنے کے لئے بھی دعائیں
موجود ہیں۔ (Rg. V. III, 46 و 32, IIII, 56.3)

اتھروید میں تاجروں کے متعلق دلچسپ باتیں ملتی ہیں۔ تاجر ایک جگہ سے
دوسری جگہ جاتے تھے۔ ان کی چیزیں اور ان کی زندگی ہمیشہ خطرہ میں رہتی
تھی۔ وہ نفع کے لئے اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ جنگلی
جانوروں کی وجہ سے ان کی زندگی اور زیادہ خطرہ میں تھی۔ سفر پر
جانے کے قبل تاجر اندر دیوتا کی عبادت کرتے تھے۔ تاکہ جنگلی میں جانوروں
اور دوسرے خطروں سے محفوظ رہیں۔ اندر کے بعد وہ "اگنی" کی عبادت
کرتے تھے۔ تاکہ انہیں سفر میں زیادہ سے زیادہ کامیابی حاصل ہو اور زیادہ
سے زیادہ دولت ملے۔ ویدوں میں تاجروں کا ایک دوسرا طبقہ بھی
ملتا ہے جسے پنی (Pani) کہتے ہیں۔ یہ طبقہ بہت دولتمند تھا۔ تاجروں
کا یہ طبقہ عوام میں مقبول نہیں تھا۔ اس لئے کہ وہ ہر شے میں نفع کا
خواہش مند تھا۔ لوگ اس طبقہ سے نفرت بھی کرتے تھے۔ اس طبقہ سے
بیزاری کی باتیں بہت جگہ کی گئی ہیں۔ روتھ (Roth) کا خیال ہے
کہ یہ طبقہ عبادت نہیں کرتا تھا۔ اس لئے پجاریوں کو اس سے نفرت تھی۔
اور عوام میں شاید اسی وجہ سے انہیں مقبولیت حاصل ہوئی۔ رگ وید
کی زبان پر قدیم عوامی زندگی کی گہری چھاپ ہے۔ قدیم عوامی بولی

کی صحیح تصویر رگ وید میں نظر آتی ہے۔ قواعد کے ہر پہلو سے یہ قدیم بولی سنسکرت سے الگ ہے۔ لہجہ اور الفاظ کی بناوٹ کے لحاظ سے اس بولی کی اپنی خاص اہمیت ہے۔ رگ وید کی زبان میں اپج ہے، انفرادیت ہے، وسعت ہے، دلکشی ہے۔ رگ وید کے مطالعہ کے بغیر زبان کی تاریخ کے ارتقاء پر روشنی نہیں پڑ سکتی۔ اس بولی میں تیکھا پن، لچک اور فنکاری ہے۔ گانے والوں نے اس عوامی بولی کو آگے بڑھایا۔ ایک خیال کو مختلف طریقوں سے پیش کیا گیا ہے اور خوب کیا گیا ہے۔ ایسے خیال کو پیش کرنے میں کسی قسم کی جھجک نہیں ہے ایک خاص قسم کی آزادی ہے۔ صفت (Preposition) حرف ربط طرز بیان، محاورہ، اصطلاح، فصاحت و بلاغت اور اظہار میں قاعدگی کی ہر جگہ ایک نئی شان ہے۔

ان ساری باتوں کے باوجود ہمیں آریوں کے متعلق کچھ اور بھی سوچنا ہے۔ اس وقت کی جغرافیائی حالت کو پیش نظر رکھنا ہے۔ آریہ ہندوستان کے رہنے والے تھے۔ یا باہر سے آئے تھے؟ آریاؤں کا تعلق دراوڑی قوم سے تھا یا نہیں؟ جن لوگوں سے آریاؤں کو لڑنا پڑا وہ کون لوگ تھے؟ آریہ ہندوستان سے باہر کب گئے۔ اور کس طرح گئے؟ ہندوستان کا قدیم کلچر اپنی بہت ساری رعنائیوں کے ساتھ باہر کس طرح گیا؟ جنوبی ہندوستان سے آریوں کا تعلق تھا یا نہیں؟ داسا اور پنیس (Panis) کون تھے؟ آریوں کے وقت میں ہندوستان کی قدرتی و آب ہوائی صورت ویسی تھی۔ جس صورت کو پیش نظر رکھ کر ہم اب تک قدیم زندگی کا تجزیہ کرتے آئے ہیں؟ — ان سارے سوالوں پر

پر غور کرنے سے بہت ساری باتیں سامنے آجاتی ہیں اور ہمارا عظیم ماضی ایک نئی صورت میں اپنی جھلکیاں دکھاتا ہے۔ ان سوالوں سے غور و فکر کی نئی راہیں کھلی ہیں۔ ان کی بنیاد پہ تجزیہ کرنے سے قدیم زبان کی ابتدا ارتقاء اور ہندوستان کی دوسری زبانوں کی تاریخ پر اچھی روشنی پڑ سکتی ہے۔ اب اس حقیقت سے کوئی تاریخ داں انکار نہیں کر سکتا ہے کہ قدیم پنجاب ہی کو سپتا سندھو (Sapta Sindhu) کہتے تھے اسکا جنوبی ہندوستان سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس لئے کہ درمیان میں ایک سمندر تھا (جہاں آج راجپوتانہ ہے) یہ سمندر آسام کے مغرب تک پھیلا ہوا تھا جسکا ایک حصہ انڈس ویلی تک تھا۔ سپتا سندھو کے تینوں طرف سمندر تھے۔ شمال میں بھی ایک سمندر تھا۔ آرکٹک اور بلیک سی (Black Sea) تک اسکا دامن پھیلا ہوا تھا۔ اب یہ سمندر اپنا وجود ختم کر چکے ہیں۔ دنیا میں حالات کی تبدیلی نے بہت کچھ بدل دیا ہے۔

بلیک سی، اورل، کیسپین۔

اب تک اسکی شہادت دے رہے ہیں۔ کہ ہندوستان کی قدیم صورت کچھ اور ہی ہے۔ رگ وید میں چار سمندروں کا ذکر ملتا ہے۔ رگ وید میں قدیم پنجاب یا سپتا سندھو کے چاروں طرف پانیوں کا ذکر موجود ہے پھر یہ کہنا کہ آریہ سمندر کے معجزوں سے آگاہ نہیں تھے۔ غلط ہے۔ اس طرح جنوبی ہندوستان کے متعلق یہ کہنا درست ہے کہ وہ ایک بہت ہی بڑے برّاعظم کا حصہ تھا۔ وہ برّاعظم برما سے مشرقی افریقہ کے ساحلوں تک پھیلا تھا۔ اس حقیقت کو بھی اب سب قبول کرتے ہیں کہ قدیم پنجاب سپتا سندھو ہندوستان کا وہ پہلا علاقہ ہے جہاں زندگی نے پہلی بار

سائنس لی تھی۔ جانوروں کی زندگی کے ارتقاء اور انسان کے وجود کی جو
شہادتیں ملتی ہیں ان کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ ان ساری باتوں
پر غور کرنے سے اس حقیقت پر بھی ایمان لانا پڑتا ہے۔ کہ دراوڑی اور
کولارین وسط ایشیا سے نہیں آئے تھے۔ ان کا پنجاب سے بھی کوئی تعلق
نہیں تھا۔ یہ بھی غلط ہے کہ دراوڑی اور کولارین آریوں سے لڑتے رہے
اور آریوں نے انہیں جنوب کی طرف مار بھگایا۔ جنوبی برعظم میں بالکل
الگ کئی اور انسانوں کی بستی تھی۔ جن کے بارے دراوڑی اور کولارین میں
ان کی تہذیب کے اعلیٰ نمونوں کو دیکھ کر بھی اس سلسلہ میں تشفی ہوتی ہے
جنوبی حصہ میں انسانوں کی جو آبادی تھی اسکا کوئی تعلق آریوں سے نہیں
تھا ـــــ رگ وید کے پر خلوص مطالعہ سے اس نتیجہ پر آنا ہی ہوگا۔ کہ
آریوں اور دراوڑی قوم کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ دونوں کا کوئی تعلق پیدا
بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ درمیان کے سمندر سے دونوں قومیں نہ لڑ سکتی تھیں
اور نہ ایک دوسرے پر اپنے اثرات ڈال سکتی تھیں۔ منو کے سیلاب کا
جو ذکر آتا ہے۔ وہ وہی سیلاب ہے جو راجپوتانہ کے سمندر میں آیا تھا
اس سیلاب سے سپتا سندھو یعنی قدیم پنجاب کی تباہی ہوئی تھی۔ لوگ
شمال کی طرف بھاگ گئے تھے۔ اور ہمالیہ کے قریب پناہ لی تھی۔ وہیں سے
آریہ باہر گئے۔ آرنگ کے علاقے میں ہندوستان کے ویدی آریوں
کی تہذیب پھیلی۔ آریہ باہر سے آئے تھے۔ اسکا کوئی جواب رگ وید میں
موجود نہیں ہے۔ ان ساری باتوں کی روشنی میں کلچر کا تجزیہ زبان کے
ارتقاء کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ رگ وید میں گمود، کوسالا، انگا، وانگا
اور بنگالہ کا بھی ذکر موجود نہیں ہے۔ دکن اور وہاں کی ندیوں اور

پہاڑوں کے نام بھی نہیں ہیں۔ دکن کے لئے سمندر ایک بڑی وجہ ہے بشرق
کے علاقوں کے متعلق اگر یہ کہا جائے۔ کہ رگ وید کے زمانہ میں ان کا وجود نہیں
تھا۔ تو غلط نہ ہوگا۔ بعض ماہرین یہ کہتے ہیں کہ رگ وید میں کی کاتا کا
لفظ ہے۔ اور اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ آریہ جنوبی بہار کو جانتے تھے
یہ بات بھی عجیب سی ہے۔ اس لفظ سے مراد وہ پہاڑی علاقے ہیں جہاں سوما
کے پودے ہوتے تھے۔ اور قدیم پنجاب میں سوما کے پودوں کی وجہ سے ان کی
شہرت تھی۔ صوبہ بہار میں رانچی کے قریب جو تانبے کے ہتھیار دستیاب ہوئے
ہیں۔ انہیں ہڑپا اور موہنجو دارو یا آریوں کے تہذیبی عناصر کی چیزیں سمجھنا
اس طرح غلط ہوگا۔ ان باتوں کی روشنی میں ہڑپا اور موہنجو دارو کی تہذیب
کا تجزیہ اور آسان ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں داسا اور داسیس کے متعلق بھی
سوچنا چاہیئے۔ جب آریہ ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ ان کی تہذیب
یہاں نکھری، جنوبی ہندوستان سے ان کا تعلق نہیں تھا۔ سمندر کی
وجہ سے بنگال و بہار کا وجود نہیں تھا۔ تو پھر وہ کون لوگ تھے جن سے
آریوں کو لڑنا پڑا اور رگ وید میں جنہیں داسا کہا گیا ہے رگ وید کے
زمانہ میں کوالاریوں اور دراوڑیوں کا وجود نہیں تھا۔ تو وہ بدصورت
لوگ کون تھے جن سے آریوں کو سخت نفرت تھی۔ رگ وید میں ان لوگوں
کو سیاہ فام کہا گیا ہے۔ وہ سیاہ اور کالے لوگ آریوں ہی میں سے تھے۔
وہ بنجارے قبیلے تھے۔ جو ترقی کی راہوں پر نہیں تھے۔ آریوں کی ترقی یافتہ
تہذیب سے دور رہنا چاہتے تھے۔ وہ لوگ آریہ تھے۔ ویدک منتروں پر
اعتقاد نہیں رکھتے تھے۔ دیوتاؤں پر انہیں اعتبار اور یقین نہیں تھا۔ لفظ
سیاہ اور کالے سے ان کے کردار پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ آریوں نے ان

بنجاروں کو کبھی پسند نہیں کیا۔ ان سے نفرت کی۔ اس لئے کہ وہ ان کے اصول پر نہیں چلتے تھے۔ ان کی تہذیب سے گھبراتے تھے۔ دیوتاؤں اور منتروں سے دور رہتے تھے۔ پینس (Panis) کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے۔ کہ قدیم پنجاب یعنی سپتا سندھو میں یہ لوگ تاجر تھے تجارت کے لئے سمندر کا بھی سفر کرتے تھے۔ جہاز بناتے تھے۔ یہ تاجر لالچی تھے۔ قرض دیکر سود لیتے تھے۔ آریوں کے اونچے طبقہ کے لوگ ان سے نفرت کرتے تھے۔ پینس کے قبیل وحشی آریوں کے قبیلے مغربی ایشیا اور مصر میں اپنے کچھ تعلقات قائم کر چکے تھے۔ ان باتوں کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایرانی آریہ وہی تھے جن کا اصل وطن سپتا سندھو یعنی قدیم پنجاب تھا۔ ہندوستانی آریہ کے کلچر کے اثرات کو ایرانی آریہ کے کلچر پر اچھی طرح دیکھا جاسکتا ہے ایرانی آریہ کافی تہذیب یافتہ تھے اور وہی زبان بولتے تھے جو ہندوستانی آریوں کی زبان تھی۔ ایران میں بھی متھرا نام کے دیوتا کی پرستش ہوتی تھی۔ آفتاب اور آگ کی پوجا ہوتی تھی۔ رگ وید کے دیوتا وہاں بھی موجود تھے۔

قدیم ہندوستان میں علم کی حفاظت اور زندگی کے تجربات کو ایک دوسرے کے پاس پہنچانے کی جو روایت تھی۔ اسکی بہت اہمیت ہے۔ زبانی سینکڑوں باتیں ایک دوسرے کے پاس پہنچتی تھیں۔ مذہبی ادب کی تخلیق کے تجزیہ میں اس پر غور کرنا پڑتا ہے۔ چار ویدوں اور ویدک ادب کے علاوہ بدھ مذہب اور جین مذہب کی بنیادی باتیں سینہ بسینہ ہی رہی ہیں۔ تحریر کے فن سے آگاہ ہونے کے باوجود بہت ساری ایسی باتیں تھیں جو اس وقت لکھی نہیں گئیں۔ اور بعد میں ان کی اہمیت کا احساس ہوا۔ انسان نے ایک دوسرے سے جس طرح جو کچھ کہا اسی طرح باتیں لکھی گئیں۔ بعض ماہرین

کہتے تھے کہ چھٹی صدی قبل مسیح فن تحریر سے لوگ آگاہ تھے۔ اور اس فن پر کافی محنت اور ریاضت ہوتی رہی ہے۔ اشوک کے کتبہ سے یہ حقیقت معلوم ہو جاتی ہے۔ کہ عوام میں تعلیم عام تھی۔ موہنجو داڑو کے رسم الخط کا تجزیہ بھی دلچسپ ہے۔ اس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ فن تحریر سے ہندوستان کے لوگ بہت پہلے سے آگاہ تھے۔ برہمی رسم الخط کے تجزیہ میں ہماری نگاہیں موہنجو داڑو کے رسم الخط پر بھی جاتی ہیں۔ قدیم ہندوستان میں لوگ پتوں پر لکھتے تھے۔ پتوں کی تراش و خراش ان کے دھوپ میں سوکھ جانے کے بعد ہوتی تھی۔ ایک خاص قسم کی روشنائی سے لکھنے کے بعد دھاگے کی مدد سے انہیں ایک جگہ کیا جاتا تھا۔ پھر کتاب تیار ہو جاتی تھی۔ لکڑی اور تانبہ سے بھی اس سلسلہ میں مدد لی جاتی تھی مشہور ماہر لسانیات ایم ونٹر منٹز (M. Winternitz) اس بات پر مصر ہیں کہ برہمی رسم الخط کو باہر سے تاجر لائے تھے۔ اور اسکا تعلق فونیشنس (Phoenicians) رسم الخط سے ہے۔ ونٹر منٹز اس کا بھی فیصلہ نہ جانے کیوں کر دیتے ہیں کہ ہندوستان میں برہمی رسم الخط کی جو صورت ملتی ہے۔ اسکا تعلق اس رسم الخط سے ہے جو میسا کے پتھر (stone of Mesa) پر ملتا ہے۔ بعض مغرب کے ماہرین نے ہندوستانی لسانیات کی گتھی کو بہت الجھا دیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس سلسلہ میں بخلوص، محنت اور دیانتداری کے ساتھ زیادہ سے زیادہ کام ہو۔

مخلص

شکیل الرحمان

زبان اور کلچر

"تھوڑے لمحوں کے لئے بھی یہ سوچنا غلط ہے کہ زبان کسی ایک انسان کی محنت کا نتیجہ ہے سماجی طور پر زندہ رہنے اور معاشرتی زندگی گزارنے میں انسان کی جو کوششیں ہو رہی ہیں۔ انہی کوششوں نے زبان کو پیدا کیا ہے۔"

شکیل الرحمٰن

سماجی کشمکش سے زبان پیدا ہوتی ہے۔ انسان سماج میں اجتماعی طور پر جدوجہد کرتا ہے۔ اس جدوجہد میں ایک انسان کو دوسرے انسان سے بہت قریب ہونا پڑتا ہے۔ ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش ہوتی ہے۔ ایک دوسرے کے خیالات، ایکدوسرے کے تعلقات اور ایکدوسرے کی دشواریوں اور الجھنوں کو سمجھنے کے لئے زبان پیدا ہوئی ہے۔ ترقی میں انسان محض ہاتھ پاؤں کے اشارے سے یہ ساری باتیں بتانے کی کوشش کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ زندگی کی رفتار اور بہاؤ اور ارتقاء کا قانون اسے زیادہ دنوں تک قبول نہیں کرسکتا تھا۔ زبان کی پیدائش کی ضرورت اسی لئے ہوئی کہ انسان اپنی ساری باتوں کو اور کائنات کی حقیقتوں کے راز کو جسم کے اشاروں سے اچھی طرح نہیں بتا سکتا تھا۔ اپنی زندگی کی ہر لمحہ تبدیلیوں کو ایسے اشاروں میں بتانا نہایت مشکل ہوتا تھا۔ زبان کی پیدائش سے انسان کو بہت سکون ہوا اس لئے کہ اس طرح اسکی بہت ساری پریشانیاں دور ہوگئیں۔ انسانی زندگی کی پیچیدگی ہمیشہ بڑھتی رہی ہے۔ باتیں الجھتی رہی ہیں۔ ایسے موقعوں پر جب کوئی معمولی بات الجھی تو اسے سلجھانے کے لئے بہت کاوشیں

کرنا پڑیں۔ تھوڑی الجھی باتوں کے لئے کافی وقت لگ جاتے تھے۔ اس طرح روز روز ایسے مسائل بڑھتے رہے جن کا سلجھانا ناممکن ہوتا گیا۔ زبان کی پیدائش میں سماجی کشمکش کا ہاتھ اس لئے بہت زیادہ رہا ہے تھوڑے لمحوں کے لئے یہ بھی سوچنا غلط ہے کہ زبان کسی ایک انسان کی محنت کا نتیجہ ہے۔ سماجی طور پر زندہ رہنے اور معاشرتی زندگی گذارنے میں انسان کی جو کوششیں ہوتی رہی ہیں انہی کوششوں نے زبان کو پیدا کیا ہے۔۔۔

اجتماعی محنت نے زبان کا بیج ڈالا ہے۔ اور سماج کی ضرورتوں نے اسے ایک خوبصورت پودا بنایا۔ پھر درخت کی شکل دی۔ خوبصورت پتے دیئے۔ اور پھل پھول دئے ہیں۔ آج اس درخت کا حسن دن بدن نکھرتا جا رہا ہے اسکی ڈالیوں میں حیات کروٹیں لے رہی ہے۔ یہ سب صرف اس لئے کہ سماجی ضرورتیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ اور انہی کے سہارے اس خوبصورت درخت کی جڑوں اور شاخوں میں زندگی کی لہریں تیز ہوتی جا رہی ہیں۔ انسان اپنی زندگی کے متعلق سوچتا ہے۔ اپنے ماحول کے متعلق سوچتا ہے۔ دوسرے انسانوں کے لئے سوچتا ہے۔ ماضی کو گھورتا ہے۔ حال پر غور کرتا ہے۔ اور مستقبل کا خیال کرتا ہے۔ وہ اپنے ذہن میں خیالات کی ایک وسیع کائنات بسائے رہتا ہے۔ یہاں عجیب ہنگامے رہتے ہیں۔ ایک خیال دوسرے خیال سے ٹکراتا بھی ہے۔ اور ایک دوسرے سے مل کر تیسرے خیال کے خلاف محاذ بھی بناتا ہے۔ انسان اپنے دماغ میں جو گفتگو کرتا ہے اسے زبان کے ذریعہ دوسرے انسانوں تک یعنی جماعت اپنے سماج اور اپنی مادی دنیا میں پہنچاتا ہے۔ اور جب اسکے خیالات اس کے ذہن سے نکل کر دوسروں کے قریب پہنچتے ہیں تو وہ سجائے ہوئے ہوتے

ہیں۔ وہ ان سارے ہنگاموں کے ساتھ باہر نہیں آتے۔ جو ہنگامے ذہن میں موجود رہتے ہیں۔ جب وہ خیالات زبان کے سہارے دوسرے انسان کے قریب آتے ہیں۔ تو ان کی وہ بے ترتیبی ختم ہو جاتی ہے۔ جو ذہن میں ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ یہ بھی واقعی نہیں کہا جا سکتا ہے کہ ان کی ایک ترتیب ہو جاتی ہے۔ جو ذہن کے ہنگاموں میں ممکن نہیں ہے انسانی ذہن میں وہ خیالات جو مبہم ہوتے ہیں جنہیں اپنے ذہن میں رکھنے والا انسان خود اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا ہے۔ جب سماج یا جماعت یا دوسرے انسانوں کے قریب ہوتے ہیں تو واضح اور صاف ہو جاتے ہیں۔ بعض جگہوں پر وہ مبہم ہوتے ہوئے بھی مبہم نہیں ہوتے۔ وہ نکھر جاتے ہیں اور واضح ہو جاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان جو کچھ سوچتا ہے اسکا تعلق زبان سے بہت گہرا ہے۔ انسانی ذہن کے اُبلتے ہوئے خیالات کو زبان سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ اور اسی طرح زبان کو انسانی ذہن میں اٹھتے ہوئے خیالوں سے علیحدہ کر کے کچھ بھی سوچا نہیں جا سکتا۔ انسانی خیالات کے آثار اور چڑھاؤ کے ساتھ زبان میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ اور انسانی ارتقاء کے ساتھ زبان ترقی کرتی ہے۔ زبان انسان کی اپنی محنت کی تخلیق ہے۔ اجتماعی اور سماجی زندگی میں انسان نے اسے جنم بخشا ہے۔ انسان نے بہت محنت کی ہے۔ مختلف کٹھن راستے دیکھے ہیں۔ پھر زبان پیدا ہو سکی ہے۔ الفاظ کے ہر ٹکڑے میں انسانی ذہن کے ہنگاموں کی کوئی نہ کوئی تصویر مل جاتی ہے اس لئے زبان داخلی اور خارجی دونوں زندگی میں توازن پیدا کرتی ہے۔ دونوں زندگی کے تعلقات کو بہتر بناتی ہے۔ اور

داخلی زندگی کی ان بہت ساری کمزور رگوں کو توڑ دیتی ہے۔ جو انسان کو کمزور، فراری، احساس کمتری کا شکار اور حد سے بڑھی ہوئی انفرادیت کا ہمنوا بنانے کے لئے اس کے ذہن اور جسم کے دوسرے حصوں میں دوڑتی رہتی ہیں۔ جب تلخیوں کا شدید احساس ہونے کے بعد بھی انسان پریشان نہیں ہوتا ۔ اور زندگی کے تاریک گوشوں سے فرار نہیں کرتا ۔ ۔ ۔ تو دل و دماغ میں ایک خاص قسم کی سختی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سختی کی پیدائش اور اسے قوت دینے میں زبان کا زبردست ہاتھ رہتا ہے۔ اس لئے کہ اسی زبان کے ذریعہ وہ انسان دوسرے انسان کے قریب ہو کر ان کے کرداروں اور ان کے جینے کے طریقوں سے اثر لیتا ہے۔ دوسرے انسان جو کچھ کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ وہ بھی انہیں دہراتا ہے۔ اس طرح ایک انسان کے کردار اور زندگی بسر کرنے کے طریقوں کا اثر دوسرے انسانوں پر ہوتا ہے۔ ممکن ہے کسی خاص ماحول کی وجہ سے ایک برے کردار کا اثر دوسرے کردار پر برا پڑے۔ زبان اس وقت بھی دل و دماغ کی نرمی، جھنجلاہٹ اور کلیلاہٹ کو زندگی دیتی ہے انسان کا ماحول زبان کو بہت متاثر کرتا ہے۔ ماحول زبان سے اچھا اور برا دونوں مصرف لے سکتا ہے۔ زبان ایک خوبصورت زمین کی پاکیزہ مٹی ہے جیسا سانچہ ہوگا۔ تخلیق بھی اسی طرح کی ہوگی۔

انسانی زندگی کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ زبان بھی بدلتی رہتی ہے۔ جس طرح انسانی زندگی کی تبدیلیوں کو روکا نہیں جا سکتا اسی طرح زبان کے فطری ارتقاء کو بھی روکا نہیں جا سکتا۔ انسان کی آواز کی تبدیلیوں کا اثر زبان پر ہمیشہ ہوتا ہے۔ یا یہ کہا جائے کہ زبان کی

فطری تبدیلیوں اور فطری ارتقاء کو انسان کی آواز کی تبدیلیوں اور ارتقاء سے علیحدہ کر کے کچھ نہیں سوچا جا سکتا۔ تو غلط نہیں ہوگا۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ نسل در نسل انسانی آواز میں برابر تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ایک نسل سے دوسری نسل تک آواز میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو زبان کی فطری تبدیلیوں اور فطری ارتقاء میں جگہ جگہ رکاوٹ پیدا ہو جائے ایسی حالت میں پھر سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ زبان کے اس فطری ارتقاء کو صحیح معنوں میں ارتقاء کہا جا سکتا ہے یا نہیں۔ ہر نئی نسل اپنے لسانی ورثہ میں اس طرح اضافہ کرتی رہتی ہے جس طرح وہ اپنے تہذیبی اور ثقافتی ورثہ میں کرتی ہے۔ اسی اضافہ سے زبان کے فطری ارتقاء کو زندگی ملتی ہے۔ زبان کی تبدیلیوں پر ہر نئی نسل کی آواز کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی لفظ عرصہ کے بعد اپنی صورت بدل دیتا ہے۔ ایک ہی وقت میں ایک ملک کے مختلف حصوں میں جہاں ایک زبان بولی جاتی ہے انسانی آواز کی تبدیلیوں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ جغرافیائی ماحول کے گہرے اثرات کا بھی اسطرح مطالعہ کیا جا سکتا ہے ——— زبان کے فطری ارتقاء پر ایمان لانا ہی پڑتا ہے۔ آج دنیا کی ساری زبانیں جس صورت میں ہمارے سامنے ہیں وہ بالکل اسی صورت میں انسان کو نہیں ملی تھیں۔ انسان نے زندگی کے لمحوں میں تراشا اور نکھارا ہے۔ اس بحث میں اب پڑنا فضول ہے کہ خیال کے پہلے زبان وجود میں آئی یا خیال کے بعد۔ اس سلسلہ میں ماہرین لسانیات نے بہت ساری باتیں کی ہیں۔ زبان سے خیال میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور خیال سے زبان میں وسعت آتی ہے۔ زبان اور خیال کے بعد تحریری شکل کے وجود کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اسے بھی سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہو سکتی۔ کہ تحریری شکل کا وجود خیال اور زبان کے وجود کے بعد عمل میں

آیا ہوگا۔ وہ ماہرینِ لسانیات جو بہت سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ تجزیہ کرتے ہوئے تحریری زبان کو بولی کی زبان سے پہلے کی تخلیق سمجھتے ہیں کہتے ہیں کہ خوفناک جانوروں سے بچنے کے لئے متحدہ طور پر جنگلوں میں پھل اور پھول جمع کرنے کے لئے انسان پہلے اشاروں سے باتیں کرتا تھا۔ اور پھر جسم کے بعض حصوں سے صاف طور پر اشارے کرنے لگا۔ اور رفتہ رفتہ درخت کی پتیوں، ڈالیوں اور زمین کی مٹی پر اپنے خیالات کا اظہار چند زاویوں اور دائروں سے کر دیا کرتا تھا۔ آخر میں عرصہ کے بعد بولی کی زبان وجود میں آئی۔ یہ بات کچھ اہم ضرور ہے لیکن ہم یہ بھی سوچتے ہیں کہ خوفناک جانوروں سے بچنے کے لئے اور جنگلی جانوروں کے خوف سے انسان کا ایک گروہ ایک جگہ نشان لگاتا ہوگا۔ تو جنگلوں کے دوسرے حصوں میں رہنے والوں کو اسکی خبر کسطرح ہوئی ہوگی۔ وہ کسطرح سمجھتے ہوں گے کہ ان کے قریب کوئی خوفناک جنگلی جانور آگیا ہے۔ پھر انسان خطرے کے وقت انسان لوگوں کو کس طرح جمع کرلیتا ہوگا۔ وہ ضرور چیخا ہوگا تاکہ اسکی آواز جنگلوں میں پھیل جائے۔ یہ بات زیادہ قابل قبول ہوسکتی ہے کہ انسان کی زبان کو حرکت پہلے ہوئی۔ اور جسم کے دوسرے اعضا کو بعد میں۔ سانپ اور بھیڑیوں اور جانوروں کے پنجوں میں پھنس جانے کے بعد انسان چیخا ضرور ہوگا۔ ذہن میں ابتدا خیال چیخ کے ساتھ باہر نکلا ہوگا۔ اور چیخ کے بعد اسے بہت سی باتیں اشاروں سے کرتے کرتے بولی کی زبان میں ادا کرنا سیکھا ہوگی۔ یہ ضرور ہے کہ کبھی اہم مسئلہ کو پتوں، ڈالیوں اور زمین پر کھینچی ہوئی لکیروں سے بتانے کی کوششیں ہوئی ہونگی۔ انسانوں کا ایک گروہ بھی کبھی دور رہنے والے اپنے دوسرے گروہوں کو بتانے کے لئے

نشانات بکھیر دیتا ہوگا۔ کہ انہیں اسکا پتہ چل سکے کہ وہ گروہ انہیں راستوں سے ہو کر گذرا ہے۔ ان باتوں کی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ آج زیادہ ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ بولی کی زبان کے بعد تحریری زبان کا وجود ہوا ہے۔ جہاں تک تحریری زبان کا تعلق ہے ماہرین کا یہ خیال ہے کہ تحریری زبان کا وجود صرف اسلئے ہوا کہ انسان اپنے ماضی کو یاد رکھنا چاہتا تھا۔ تاریخ نویسی بھی یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ تحریری زبان کا وجود صرف اسی وجہ سے نہیں ہو سکتا تھا اسلئے کہ ماضی کے ساتھ ساتھ انسان کو اپنے حال کا بھی خیال تھا۔ اور حال میں زندگی کے لئے وہ جو بھی جد وجہد کرتا تھا اسے عمل میں لانے کے لئے اور سماج میں ایک دوسرے سے قریب رہنے کے لئے وہ اپنی زبان کو تحریری شکل بھی دیتا تھا۔

یہ بات تھوڑی دیر کے لئے بھی سوچنا غلط ہے کہ خیال زبان سے الگ کوئی شے بن کر رہ سکتا ہے۔ خیال اور زبان کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ خیال کا وجود زبان کے بغیر ناممکن ہے۔ انسان جو کچھ سوچتا ہے اسکی بنیاد زبان پر مبنی ہے۔ اس بنیاد کے بغیر خیال کی تخلیق نہیں ہو سکتی ہے۔ اسٹالن نے جب ان۔وای۔مار (N. Y. MARR) کے خیالات پر سخت تنقید کی اور مار کی غیر سائنسی تھیوری) اور تھیوری کے غیر سائنسی کردار کو نمایاں کیا۔ تو لسانی دنیا میں ایک ہل چل مچ گئی۔ بڑی بڑی بحثیں ہوئیں۔ اور سائنسی اور غیر سائنسی تصورات کے تجزیہ میں بہت، آسانی ہوئی۔ ابھی حال میں روس کی لنگوسٹکس انسٹیچوٹ آف دی اکیڈمی آف سائنس (The Lingostic institue of Academy of sciences of the U. S. S. R) نے دو جلدوں میں ایک

09.11
27

178658

سمپوزیم تیار کیا ہے۔ جس میں ان۔ وائی۔ مار، آئی آئی مشکوب (I. I. Meshchaninov) پروفیسر اس۔ ڈی۔ کاسنلسن (S. D. Katsnelson) پروفیسر این۔ ایف یعقولیب (Prof. N. F. Yakovlev) اور پروفیسر اف۔ پی۔ فیلن (F. P. Filin) اور دوسرے ماہرین کے فلسفوں پر بحث کیگئی ہے۔ اس بحث کی کسوٹی اسٹالن کے خیالات ہیں لسانیات پر۔ اسٹالن کے خیالات جو کچھ بھی ہوں ان کی بنا پر ان ماہرین لسانیات کے تصورات اور خیالات کا تجزیہ کیا گیا ہے اور جانچا گیا ہے۔ اس سمپوزیم میں سائنسی اور غیر سائنسی اور مارکسی اور غیر مارکسی نظریہ اور کردار کی تصویر صاف طور پر سامنے آجاتی ہے اسٹالن نے جہاں ان۔ وائی مار کی اور دوسری باتوں پر سخت تنقید کی ہے وہاں مار کے اس خیال کو بھی غلط بتایا ہے کہ خیال اور سوچ کا زبان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مار کے خیالات میں یہ بات اہم ہے کہ عوام بغیر زبان کے بھی ایک دوسرے سے مل سکتے ہیں۔ قریب آسکتے ہیں اور ایک دوسرے کو سمجھ سکتے ہیں۔ مار اس طرح عملی دنیا سے بہت دور چلا جاتا ہے۔ خیال اور تصوراتی کائنات میں ایسی غیر سائنسی باتوں کا گذر ہو سکتا ہے۔ کارل مارکس نے بھی کہا تھا کہ زبان خیال کی وہ حقیقت ہے جو بالکل براہ راست ہے۔ ان، وائی مار نے اس سلسلہ میں بہت ٹھوکریں کھائی ہیں۔

پیرو کی قدیم آبادی اور قدیم لوگ ایک خوبصورت جھالر کی ڈوریوں کو عجیب طریقوں سے ترتیب دے کر جنگ، صلح، شادی، موت پیدائش، دعوت، شکار وغیرہ کے اہم واقعات کو یاد رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ یا کسی پوشیدہ جگہ پر زمین صاف کرکے یا کسی بڑے درخت پر ایک

قسم کی خوبصورت جھالر کی ڈوریوں کی طرح کوئی چیز پھیلا دیتے تھے (ڈوری کہیں الجھ جاتی تھی اور کہیں سیدھی ہوتی تھی۔ یہی وہ نشانات تھے جن سے وہ لوگ بہت ساری باتیں یاد رکھتے تھے۔ ڈوری کو دھوپ دکھا کر جب زمین یا درخت سے چمٹ جاتی تھی۔ اور کبھی چھوڑتی نہیں تھی۔ البتہ کبھی کبھی کوئی آندھی آتی تھی اور بارش ہوتی تھی۔ تو ڈوری جابجا ٹوٹتی تھی۔ جسے وہ لوگ پھر اسی ترتیب میں رکھ دیتے تھے۔ کسی اعلان یا پروگرام کی خبر زمین اور درخت پر اس خوبصورت جھالر کی ڈوریوں کو پھیلا کر دیتے تھے۔ وہ اپنی نرالی تحریروں سے بھی کام لیتے تھے۔ جب کہیں کوئی شادی ہوتی تھی تو جھالر کی ڈوری ایک لجاتی ہوئی دلہن کی طرح زمین یا درخت سے چمٹ جاتی تھی۔ جھالر کی ڈوری سے مختلف دائرے بنتے تھے۔ مختلف زاویے بنتے تھے۔ اور انہیں اشاروں سے حال کی بہت ساری باتیں بیان کر دی جاتی تھیں تحریری زبان کا وجود صرف اس لئے نہیں ہوا کہ قدیم باشندے اپنے ماضی کے واقعات کو محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ بلکہ اس لئے بھی ہوا کہ وہ حال میں جو جدوجہد کرتے تھے انہیں زندگی مل سکے۔ اور مستقبل کے متعلق کچھ سوچا جا سکے۔ فن تحریر کی دوسری منزل وہ ہے جہاں انسان تصویریں بنا بنا کر اپنے خیالات اور جذبات کی تصویر کشی کرنے لگا تھا۔ فن تحریر کی پہلی اور دوسری منزل ایک دوسرے سے اسقدر قریب ہیں کہ دو الگ الگ منزل قرار نہیں دئے جا سکتے۔ تصویروں میں خیالات کا اظہار اس طرح دوسری منزل بن سکتا ہے۔ اسے بعض ماہرین نے تیسری منزل قرار دی ہے جو مناسب نہیں ہے۔ اسے دوسری منزل سمجھنے سے ہم لوگ صاف طور پر رفتار کو سمجھ سکیں گے اور سست رفتاری کا بھی احساس ہو سکے گا۔ اس طرح ان

جانوروں کو صاف طور پر دیکھ سکیں گے۔ جو بعض مقاموں پر ایسے گھوم گئے ہیں کہ ان کا دیکھنا اور انہیں پرکھ لینا مشکل ہے) چین کے قدیم باشندے جب تصویروں کی زبان میں گفتگو کرتے تھے تو ہر چیز کی مکمل تصویر بنایا کرتے تھے۔ سامری خط میں یہ تصویر آدھی بنائی جانے لگیں۔ اس لئے اتنا وقت صرف نہیں ہوتا تھا۔ جتنا چین کے قدیم باشندے صرف کیا کرتے تھے۔ جانوروں کی مکمل تصویریں بنانے میں وقت زیادہ صرف ہوتا تھا۔ سامری خط (سمیریوں کا خط) صرف جانوروں اور آدمی کے سر بنا کر یا جسم سے صرف ایک حصہ کی تصویر بنا کر بہت وقت بچا لیتے تھے۔ چین میں آج بھی جبکہ بیس تیس لفظوں کا تلفظ ایک ہے بہت سی ایسی تصویریں ہیں جن سے سمجھنے اور سمجھانے کا کام لیا جاتا ہے۔ یہ تصویریں بہت ساری باتوں کی طرف اشارے کرتی ہیں۔ چینی زبان سیکھنے سے قبل یہی تصویریں سمجھائی جاتی ہیں۔ ان تصویروں کے اشاروں کو سمجھ لینے کے بعد چینی زبان باضابطہ طور پر پڑھائی جاتی ہے۔ سمیریوں نے پہلے لکڑی کی تختیوں پر لکھا پھر مٹی کی تختیوں پر اور میدین (Medians) مٹی کی تختیوں پر ہاتھی دانت کی بنی ہوئی تصویریں ٹھونک دیا کرتے تھے۔ ان طریقوں کو دیکھکر سخت حیرت ہوتی ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ تحریری زبان کتنے کٹھن راستوں سے گذری ہے۔

پرسی پولیز (Presepolis) کی تصویریں سے اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ اپنے خیالات کے اظہار کے لئے انہوں نے ایک نئی شکل تراش لی تھی۔ اور اسی کی الٹ پھیر سے وہ سب کچھ کہہ جاتے تھے۔ وہ شکل یہ تھی:۔

V

بڑی سی بڑی بات کو بیان کرنے کے لئے انہیں کئی V کی ضرورت ہوتی تھی۔ شکل ایک ہی قسم کی ہوتی تھی۔ لیکن ترتیب مختلف ہوتی تھی۔ یورپ کے ماہرین اتیک پرسی پولیز (Persepolis) کی زبان نہیں سمجھ سکے ہیں۔ چمپولین (champollion) نے ایک جگہ لکھا ہے کہ تصویروں سے خیالات کو سمجھ لینا جتنا آسان ہے اتنا اس شکل (V) سے خیالات کے اظہار کو سمجھنا آسان نہیں ہے۔ چمپولین قدیم زبانوں کو سمجھنے کا ماہر تھا۔ اس کا خیال ہے کہ وہ آخیر وقت تک پرسی پولیز کی زبان سمجھنے سے قاصر رہا۔ اس لئے کہ یہ لوگ صرف ایک ہی شکل کو مختلف ترتیب دیکر خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ کہیں دو اوپر اور نیچے ہوکر یوں ہو جاتا تھا:۔

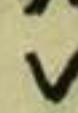

اور کبھی چار V یوں:۔

چار V کی شکل صرف یہی نہیں تھی۔ کبھی یہ:۔

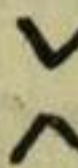

اور کبھی یہ:——

اور کبھی یوں:——

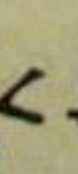

اسی طرح ایسی ایسی صورتیں موجود ہیں کہ ماہرین اب تک نہیں سمجھ سکے ہیں

ظاہر ہے کہ ان زاویوں سے کچھ نہیں سمجھا جاسکتا ... اتنا ضرور ہے کہ پروسی کولیز بڑی بڑی باتوں کے بیان میں بھی اپنا وقت بچا لیتے تھے۔ یہی کیا کم عجیب بات ہے کہ وہ صرف ایک شکل کو مختلف موقعوں پر مختلف ترتیب میں رکھتا جاتے تھے۔

سمیریوں نے تصویروں کے ذریعہ اپنے خیالات کو ایک دوسرے کے قریب پہنچا دیا ہے۔ جب وہ بڑی بڑی باتوں کو بیان کرتے تھے تو انہیں تصویروں کی وجہ سے بڑی تکلیف اٹھانا پڑتی تھی۔ تھوڑی سی بات کہنے کے لئے انہیں کافی محنت کرنا پڑتی تھی۔ زیادہ وقت صرف کرنا پڑتا تھا۔ آہستہ آہستہ انہوں نے اپنی تصویریں چھوٹی کردیں۔ اور کچھ عرصہ بعد وہ تصویریں ایسی ہوگئیں جنہیں تصویر نہ کہا جائے تو بہتر ہے۔ وہ پہلے مچھلی کے لئے یہ تصویر بناتے تھے:۔

اور کچھ عرصہ بعد جب تبدیلی ہوئی تو مچھلی کی صورت یہ ہوگئی:۔

اسی طرح بیل کی صورت جو پہلے یہ تھی:۔

بدل کر ایسی ہوگئی:۔

اور آفتاب کی صورت دائرہ ○ سے یوں بن گئی:۔

اسی طرح سمیریوں کی وہ بہت سی تصویریں جو آسان تھیں مشکل ہوگئیں۔ اور بہت ساری وہ تصویریں جو مشکل تھیں آسان ہوگئیں۔ وہ تو ٹھیک کرنا

چاہتے تھے۔ اپنے الفاظ کو اس سلسلہ میں انہیں بہت کچھ کامیابی بھی ہوئی۔ سمیریوں کی خواہش تھی۔ کہ وہ اپنی تصویروں کو زیادہ سے زیادہ آسان بنائیں۔ جو تصویریں آسان ہوگئیں وہ تو ٹھیک ہی ہوئیں۔ لیکن جو تصویریں آسان سے مشکل ہوگئیں ان کے متعلق کچھ سوچنا پڑتا ہے۔ سمیریوں نے صرف انہیں تصویروں کو مشکل بنایا ہے جو ہر وقت بنائی جاتی تھیں۔ اور جن تصویروں کی وہ عزت کرتے تھے۔ ان کے خداؤں اور دیوتاؤں کی تصویریں مشکل سے بنتی تھیں۔ اور وہ تصویریں مشکل سے بنتی تھیں۔ جن سے دوسروں کو دھوکہ اور فریب دینے کا خطرہ ہوتا تھا۔ اپنی تصویروں کو آسان اور مشکل بناتے وقت انہوں نے پرسی پولیز کی طرح ایک شکل تراش لی تھی۔ اور اسی کو الٹ پلٹ کر ایک کے ساتھ چار اور چار کے ساتھ تین شکل ایک جگہ رکھکر کوئی چیز بنا لیتے تھے۔ پرسی پولیز کی شکل ۷ تھی اور سمیریوں کی ۷۔ سمیرین سیاہ چمڑے کے لوگ تھے۔ مضبوط اور محنتی تھے۔ وہ لوگ جس جگہ رہتے تھے اسے وہ "گنگی" کہتے تھے۔ پہلے یہ لوگ پہاڑوں پر رہتے تھے لیکن آہستہ آہستہ زمین پر اترنے لگے۔ آخیر میں پہاڑوں سے ان کا رشتہ بہت کمزور ہوگیا۔ صرف اپنے بعض دیوتاؤں کے سامنے سر جھکانے اور پتھروں کے سلینوں پر کچھ ضروری باتیں لکھنے کے لئے وہ پہاڑوں پر جاتے تھے۔ جب جاتے تھے تو ان کے ساتھ پورا قافلہ جاتا تھا۔ زمین پر آنے کے بعد اپنے مکان کی تعمیر کے لئے وہ پہاڑوں سے بڑے بڑے پتھر اپنے کاندھوں پر اٹھا لیتے تھے۔ اجتماعی طور پر کام کرنے میں انہیں اپنے ترشے ہوئے الفاظ سے بہت فائدہ ملتا تھا۔ وہ کبھی کبھی پہاڑوں کی چوٹیوں پر آگ جلاتے تھے۔ اس لئے کہ گرمی محسوس کرکے ان کا خدا ان سے خوش ہوتا تھا۔ ایسے راستوں کو جن راستوں سے گذر کر وہ اپنے دیوتا کے قریب جاتے تھے۔ خوب صورت پھولوں سے

سجاتے تھے۔ ایسے موقعوں پر وہ درختوں، پہاڑوں، چٹانوں، مکانوں اور ریت پر بہت محنت سے تصویریں بناتے تھے تاکہ قبیلے میں اس اہم تہوار کی خبر عام ہو جائے۔ ٹھیک وقت پر پہاڑ پر سمیرین قبیلے جمع ہوتے تھے۔ اور آگ جلائی جاتی تھی۔ ایسے موقعوں پر جو تصویریں بنتی تھیں یہ ہوتی تھیں:-

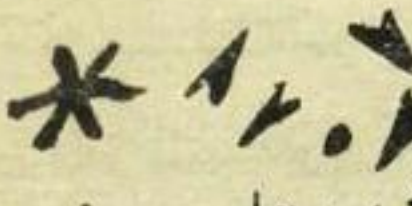

پہلے تو آگ پہاڑوں کی چوٹیوں پر جلی پھر رفتہ رفتہ سمیرین اس تہوار کو زمین پر منانے لگے۔ چونکہ آگ جلانے کے لئے اونچی جگہ کی ضرورت تھی۔ اسلئے وہ زمین پر چھوٹے چھوٹے ٹیلے بنانے لگے اور انہیں ٹیلوں پر آگ جلاکر عبادت ہونے لگی۔ تقریباً سو سال بعد جب سمیرین بالکل ختم ہو چکے تھے۔ یہودی میسوپٹامیا کی سرحد میں اترے تھے۔ اسوقت بھی سمیرین کے وہ خوبصورت ٹیلے موجود تھے۔ سبز گھاس پر اٹھے ہوئے سفید سیاہ ٹیلے یہودیوں کو متاثر کئے بغیر نہ رہ سکے۔ سمیرین کو بائیبل میں کہا گیا ہے کہ اس قوم نے مشرق سے سفر شروع کیا۔ شنیار کی وادی میں داخل ہوئے (بائیبل میں شینار کی وادی غالباً جنوبی میسوپٹامیا کو کہا گیا ہے) دراصل یہ سمیرین قوم کی قدیم جگہ تھی۔ سمیرین زبان کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہ انسان کی سب سے قدیم زبان ہے۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا..... کہ سمیرین ایشیا کی قوم تھی۔ ان لوگوں کے جسم اور شکل و صورت کی جو تصویریں سامنے آئی ہیں اور پھر ان کے کلچر کے جو حالات معلوم ہوتے ہیں۔ ان سے سمیرین ہندوستان کے باشندے نظر آتے ہیں۔ سمیرین عراق کی زمین کو بھی اپنی تہذیب کی روشنی سے نکھارتے رہے۔ ان کا زمانہ تین ہزار سال قبل مسیح کا زمانہ ہے۔ عہدِ وحشت سے

انسان کی تہذیب بہت آگے بڑھ گئی تھی۔ قدیم جمہوری زندگی میں لکھنے کے طریقوں اور حساب کے علم کو بھی سمیرین حاصل کرتے رہے۔ یہ دور تجربوں کا دور تھا۔ انسان کی تخلیقی قوتوں کا اظہار صحیح معنوں میں پہلی بار ہو رہا تھا۔ انہوں نے شہر بسائے اور شہر اجاڑے۔ ان کے یہاں اتحاد بھی رہا اور جنگ بھی ہوتی رہی زمین اور پانی کے لئے جنگیں اکثر ہوئی ہیں۔ ان کے یہاں جنگ میں جو رتھ کے پہیئے تھے وہ ہندوستانی معلوم ہوتے ہیں۔ کاشتکاری اور جنگی سامان کی طرف توجہ دینے کے ساتھ ساتھ ان کے درمیان انسان کو غلام بنانے کا تصور ابھرا۔ جنگ کے بعد جنکی شکست ہوتی تھی وہ غلام بنجاتے تھے۔ ان کی حیثیت وہی ہوتی تھی جو جانوروں کی حیثیت تھی۔ ان کے پاس ان کا سیاسی شعور تھا۔ فنی اور تخلیقی شعور کے ساتھ سماجی اور معاشی حالات کو موافق بنانے کی جد و جہد تھی۔ سمیرین کے معنی "سرزمین جنوب کی قوم" لئے گئے ہیں۔ یہ اس لئے کہ کچھ عرصہ پہلے تک انہیں عراق کی سرزمین کا باشندہ کہا جاتا تھا۔ جنوبی ایشیا کے قدیم کلچر سے ان کا کلچر اتنا قریب ہے کہ دونوں کو علیحدہ کر کے سوچا نہیں جا سکتا ہے۔۔ اس قوم نے سمیریا میں جو شہر بسائے تھے ان میں کش (Kish) ار (Ur) نیپور (Nippur)، یورک (Urruk) اُمّا (Umma) لگاش (Lagash) مشہور تھے۔ یہ شہر مختلف شاہی خاندانوں کے نام پر تھے۔ کش پہلا شاہی خاندان کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد اُورک خاندان آیا۔ اس خاندان کے پہلے بادشاہ کا نام اَن انامس کم گیشر بتایا جاتا ہے۔ جس کے متعلق وہاں کے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ وہ سورج کا بیٹا تھا۔ ار (Ur) تیسرا شاہی خاندان تھا۔ اس خاندان کا پہلا بادشاہ "مس آنی بدا" تھا۔ اس نے نوے برس حکومت کی تھی۔ "آن بدا"

اس کا لڑکا تھا۔ جس کے متعلق ایک نہایت ہی قدیم مندر پر کچھ لکھا ہوا ملتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ باپ بیٹے دونوں نے ملکر نوے برس حکومت کی تھی۔ اس خاندان نے تین ہزار پانچسو سال قبل مسیح حکومت کی تھی۔ اُر کے کھنڈروں میں اس قوم کے متعلق بہت ساری باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ تانبے کی دریافت اس وقت ہو چکی تھی۔ لہذا مندروں کے دروازوں پر تانبے لگے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ اس میں ان کی نقاشی بھی ہے جو بہت معمولی ہے لیکن اس سے اس کا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ ان کی تخلیقی قوتیں کام کر رہی تھیں۔ ایک عقاب کی تصویر بھی ہے جسکی چونچ نہیں ہے بلکہ اسکی چونچ کی جگہ انسان کا چہرہ ہے۔ قدیم ہندوستان میں بھی ایسی تصویریں موجود ہیں جن میں جسم جانور کے ہیں اور چہرے انسان یا جسم انسان کے ہیں اور چہرے جانوروں کے اور بھی جو تصویریں ملتی ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سمیرین فن تصویر کشی کی طرف بھی مائل تھے۔ بیلوں کی قطاریں، گائیں، دودھ کی دھاریں، مکھن بنانے کے طریقے یہ سب کچھ تصویروں میں نظر آتے ہیں۔ کہیں کوئی مکھن بنا رہا ہے۔ اور کہیں کوئی گائے کے دودھ سے اپنا برتن بھر رہا ہے۔ سمیرین کے ساتھ گائے اور بیل تھے۔ لہذا وہ دودھ اور کھیتی کی قدر و قیمت جانتے تھے۔ مٹی کی تختیوں پر لکھا جاتا ہے۔ کپڑے بننے کا فن بھی لوگوں کو معلوم تھا۔ ان کی عورتیں بڑے بڑے چوغے پہنتی تھیں۔ زیوروں کا بھی انہیں بہت شوق تھا۔ ان کے ٹوٹے ہوئے مندروں کو دیکھکر ایسا لگتا ہے جیسے وہ مصنوعی پہاڑ ہیں۔ سمیرین یہ سمجھتے تھے کہ بڑے بڑے مندروں میں ان کے دیوتا رقص کرتے ہیں اور تماشے کرتے ہیں لہذا بڑے مندروں میں مافوق الفطرت قوتوں کے لیے تھیٹر ہال کی طرح بڑے

بڑے کمرے ہوتے تھے۔ موسیقی اور گیتوں کی طرف بھی ان لوگوں نے دھیان دیا۔ دیوتاؤں کو خوش رکھنے کے لئے خوب گیت گائے جاتے تھے اور انسان کی حیثیت دیوتاؤں کے سامنے کچھ نہ تھی۔ یہی بات ہر وقت سمجھی گئی۔ ایک دیوار پر یہ لکھا ہوا پایا گیا ہے۔ "انسان جو کچھ بھی کرے اسکی زندگی ہوا ہے"۔ ان کے مندر کی صورت ایسی ہوتی تھی۔

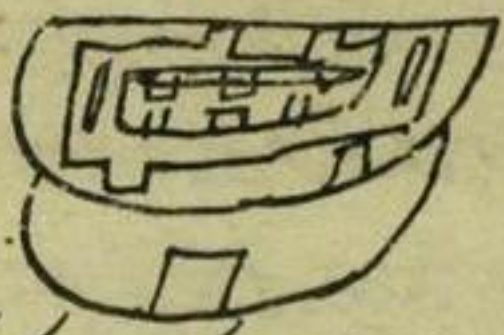

باہر کی دیوار سے یہ بتایا جاتا تھا کہ اس کے اندر کی جگہ مقدس ہے۔ اندر کی عمارت شہر کی سڑکوں سے پچاس فیٹ اونچی ہوتی تھی۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ انسان دیوتاؤں کا غلام ہے۔ ان کی ہر جدوجہد دیوتاؤں کے لئے ہوتی تھی۔ مندروں کے متعلق ان کا یہ خیال تھا کہ مندر مقدس دیوتاؤں کے ارضی مکانات ہیں۔ وہ یہ بھی سوچتے تھے۔ کہ زیادہ محنت کرنے والا انسان مرنے کے بعد دیوتاؤں کے ساتھ ان کی ان عمارتوں کی بھی سیر کرتا ہے جو آسمانوں میں ہے۔ پروہتوں کا مقام سماج میں بہت بلند تھا۔ ان کے لئے مندروں کے قریب مکانات بنائے جاتے تھے۔ پروہتوں کی فند بہت زیادہ تھی۔ تمام شہر دیوتاؤں کی حکومت میں تھے۔ اور پروہت دیوتاؤں کے مشوروں سے بادشاہوں کو آگاہ کرتے تھے۔ بزرگ اور پروہت ننگے رہتے تھے۔ شادی اور موت میں ننگے شریک ہوتے تھے۔ مندروں کے لئے سیمری کھیت آباد کرتے تھے۔ مندروں میں اناج رکھے جاتے تھے۔ اور ان کا استعمال خاص خاص موقعوں پر ہوتا تھا۔ (UR) میں ملکہ

شب اد کی قبر سے کچھ چیزیں ایسی پائی گئی ہیں جن پر سمیرین فن کو دیکھا جاسکتا ہے۔ اقتصادی ضرورتوں کی وجہ سے ہندسے دریافت ہوئے۔ اور مندروں کے حساب کتاب رکھے گئے۔ مختلف قبروں سے ایسے حساب نکلے ہیں ان کے الفاظ میں تصویریں بھی ہیں اور مختلف اشارے اور سمبل بھی۔ سمیریوں کو اشاروں اور سمبل کے ساتھ آواز کی اہمیت کا بھی احساس ہوا۔ آواز اور معنی کا تعلق گہرا نہیں تھا۔ پانچہزار سال قبل کی ان کی ایک تحریر مٹی کی تختیوں پر دستیاب ہوئی ہے۔ ماہرین لسانیات کہتے ہیں کہ اس میں کسی مندر کے حساب لکھے ہوئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سمیریوں کے درمیانی سات بہت بڑے معلم گذرے ہیں۔ جنہوں نے سمیریوں میں فن تحریر اور دوسرے فن کو رائج کیا۔ ان لوگوں کے متعلق بہت ساری کہانیاں مشہور ہیں۔ ایک دلچسپ کہانی میں یہ بات ہے کہ خانہ بدوشوں میں کوئی ایک بڑا عالم تھا۔ جس کا نام "ادانیس" تھا۔ وہ مچھلی کی کھال پہنتا تھا۔ اس نے اس قوم میں لکھنے کے فن کو رائج کیا۔ لوگوں کو تعلیم دی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ مچھلی نما انسان تھا۔ دن بھر تعلیم دیتا تھا۔ اور رات کو کنوئیں میں چھپ جاتا تھا۔ ایک لوح پر سات معلموں کے نام ملتے ہیں۔ وقت کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ سمیریوں کی آبادی بہت مخلوط ہوگئی۔ عربی، شامی، اور کوہستانی لوگ ملتے گئے۔ اسکا اثر زبان پر بھی گہرا ہوا۔ بہت سے کتبے ایسے ملے ہیں جن میں سمیری زبان کے ساتھ اکادی زبان بھی ہے۔ سارگون نے جو سمیری نہیں تھا۔ پچاس سال سے زیادہ حکومت کی۔ وہ کیش کے بادشاہ آرال بابا کا ساقی تھا۔ پتھر کی ایک تختی پر سارگون کی ابتدائی حالت کا بیان ہے۔ یہ بیان سارگون کی زبان میں ہے جو منظوم ہے دو ہزار سات سو سال قبل مسیح سارگون نے سمر اور اکد پر حکومت کی تھی۔

اور وادی کی تمام جگہوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ پچاس سال سے زیادہ حکومت کے بعد اسکی قوم کے کچھ افراد نے اسے قتل کر دیا۔ اسکی موت کے بعد اسکے خاندان کی بہت تباہی ہوئی۔ شمالی کوہستان کی ریاست "گو" کے کچھ لوگوں نے اکادیہ پر حملہ کر دیا۔ اور اس قوم کو بہت پریشان کیا۔

یہ تو ہمیں معلوم ہے کہ مصر (Egypt) کے قدیم لوگ پتھر اور لکڑیوں پر تصویریں بنا کر اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ اور ان لوگوں کے جملوں میں وہ وہ ربط اور سلسلہ پیدا نہیں ہوا۔ جو صحیح معنوں میں ہونا چاہیئے تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان لوگوں کے طرزِ تحریر پر ایشیا، یورپ کی قدیم آبادی کے گہرے اثرات تھے۔ فونی سینس نے مصر کی بھی کچھ تصویریں لیں اور سمیری زبان سے کافی مدد لیکر اپنی ایک خاص زبان کی تخلیق کی۔ یہی حروف کچھ عرصہ کے بعد یونان آئے اور یونانیوں نے ان میں کچھ اپنے حروف شامل کر دیئے۔ اور پھر یہ حروف اٹلی پہنچ گئے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ مصریوں نے اپنا وقت بچانے کے لئے اپنی تصویروں کو ہر ممکن چھوٹی بنانے کی کوشش کی تھی اور اپنے مقصد میں کامیاب رہے تھے یہ لوگ بہت ذہین تھے۔ ان کی قوت یاداشت کے متعلق سوچ کر حیرت ہوتی ہے۔ کہ آخر یہ لوگ کس طرح ساری تصویر کو ذہن میں محفوظ رکھتے تھے اور وقت پر ہر شخص وہی تصویر بناتا تھا۔ جو اسے بنانا تھا۔ بعض ضروری باتوں کو یاد رکھنے کے لئے یہ لوگ وادی نیل کی مٹی استعمال کرتے تھے۔ نیل کی مٹی سے چوڑی اور لمبی تختیاں بناتے تھے۔ اور ان پر ضروری باتیں تصویروں میں لکھتے تھے۔ یہ مصری دائیں اور بائیں دونوں جانب سے لکھتے تھے۔ اور بعض وقت لکھنے کے لئے کالم بنا لیا کرتے تھے۔ کالم خاص طور

پر اس وقت بنتے تھے۔ جب وہ اطمینان سے کسی خیال کا اظہار کرتے تھے
شادیوں اور دوسرے خوشی کے موقعوں پر کالم کا استعمال خاص طور پہ
ہوتا تھا۔ مصریوں کی تصویروں میں رفتہ رفتہ اشاریت اور سمبل ازم
(symbolism) کو کافی دخل ہو گیا۔ وہ ساری تصویریں جو بہت
محنت سے بنائی جاتی تھیں۔ وہ بہت آسانی سے تھوڑے وقفہ میں بنائی
گئیں۔ ایک تصویر سے کئی معنی لئے جانے لگے۔ مثلاً یہ شکل دیوار کے لئے بنائی
جاتی تھی۔ یعنی اس شکل سے مراد صرف دیوار ہوتی تھی

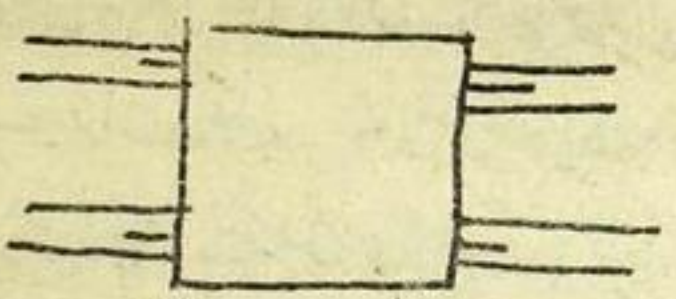

لیکن جب اشاریت کو ان کی تحریر میں جگہ ملی۔ تو اس شکل سے بڑے
بڑے مکانات کی طرف بھی اشارہ سمجھا گیا۔ یہ بڑی بات تھی۔
اشاریت کو شامل کر کے بہت ساری مشکلوں کو آسان بنا دیا گیا۔ مثلاً
غلام یا نوکر کے لئے صرف یہ تصویر کھینچ دی جاتی تھی:۔

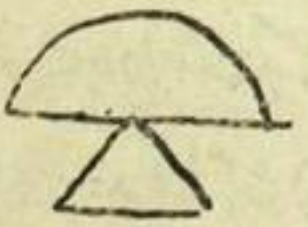

اور ہوا کے لئے صرف یہ نقشہ کھینچ دینا کافی تھا:۔

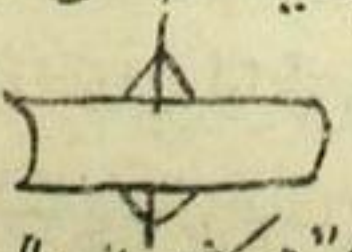

صرف یہ کہنے کے لئے کہ "مجھے کشتی پر لے چلو"۔ مصری یہ تصویر بناتے تھے:۔

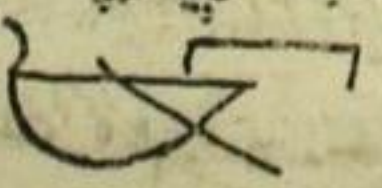

رفتہ رفتہ مصری عیسائیوں نے یونانی الفاظ کو اپنانا شروع کیا۔ لیکن چونکہ بعض مصری الفاظ ایسے تھے جن کی آواز یونانی خطوں میں قطعی نہیں پائی جاتی تھی۔ اسلئے کچھ نئے الفاظ کا خاص طور پر اضافہ کیا گیا۔ یونانی حروف اور رسم الخط میں مصری آواز پیدا کرنے کے لئے جو نئے حروف لائے گئے ان کی چند مثالیں بھی دیکھئے۔

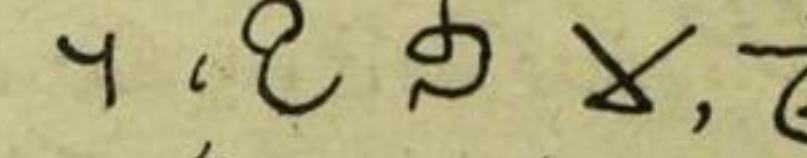

تحقیق کے بعد پتہ چلتا ہے کہ انہیں چھ حرفوں کا اضافہ ہوا تھا۔ ان کے علاوہ دوسرے حروف نہیں تھے۔ لیکن بعض ماہرین اس خیال سے متفق نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یونانی حرفوں اور رسم الخط میں مصری آواز کی گونج پیدا کرنے کے لئے بہت سارے حروف تراشے گئے تھے۔ بات جو بھی ہو۔ لیکن اسکا ثبوت ضرور ملتا ہے کہ مصری عیسائیوں نے چند نئے حرفوں کا اضافہ صرف اس لئے کیا تھا۔ کہ وہ یونانی رسم الخط اور حرفوں کو اپنانا چاہتے تھے اور بعض مصری آوازوں کے لئے یونانی زبان میں کہیں آواز پیدا کرنے والے حروف نہیں تھے۔ مصری عیسائی کچھ دنوں کے اندر یوں لکھنے لگے:۔

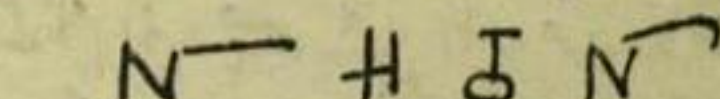

تمہارے لئے

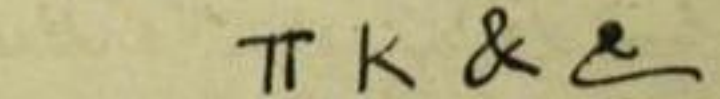

زمین یا دنیا

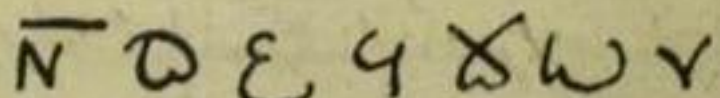

چور یا ڈاکو

مصری حرفوں یا خطوں کی آوازیں یوں سمجھی جا سکتی ہے

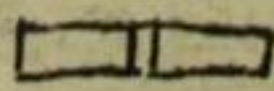

ش

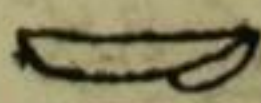

ک

کہا جاتا ہے کہ مصریوں کو اپنے گھر سے جتنی محبت تھی اتنی محبت انہیں اپنے وطن سے بھی نہیں تھی۔ اپنے گھر اور اپنے خاندان سے یہ لوگ بے پناہ محبّت کرتے تھے۔ باپ گھر کا مالک سمجھا جاتا تھا۔ اور ماں کی اہمیت صرف اس لئے زیادہ تھی کہ وہ بچوں کی پرورش کرتی تھی۔ اور بچوں کی پیدائش کے بعد ان کے لئے خوبصورت نام رکھتی تھی۔ یہ لوگ ماں کے نام پر زیادہ فخر کرتے تھے۔ بھائی بہن میں شادیاں [illegible] ہوتی تھیں۔ بادشاہ کی عزت پر مرنے کو سب تیار رہتے۔ ملک کا بادشاہ جتنی شادیاں چاہتا [illegible] کرتا تھا۔ ان لوگوں کا ایک طبقہ تھا جو ایک اچھے اور شریف آدمی کی موت پر بے شمار عورتوں کو قتل کر دیتا تھا۔ اسے اس کا یقین تھا کہ یہ عورتیں دوسری دنیا میں جا کر اس شریف آدمی کی خدمت کریں گی۔ یہ بھی عجیب بات ہوتی تھی کہ عورتوں اور مردوں کے نام میں کچھ بھی فرق نہ ہوتا تھا۔ زیادہ تعداد تو ایسی عورتوں اور مردوں کی تھی جن کے نام ایک جیسے تھے۔ ایک مرد دو شادیاں کرتا تھا۔ اور دونوں عورتوں کے نام زیادہ تر ایک ہوتے تھے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ شوہر اور بیویوں کے نام ایک ہو جاتے تھے۔ ایک والدین کے دو بچوں کے نام بھی ایک ہوتے تھے۔ دولت مندوں کے بچے گیند کھیلتے تھے۔ لیکن غریب اور مفلوک الحال لوگوں کے بچے اپنے مکان کے سامنے زمین پر لوٹتے تھے۔ یہی ان کا پسندیدہ کھیل تھا۔

غریبوں کے بچے بچپن ہی سے سخت محنت کرتے تھے اور سخت کام

سنبھالتے تھے۔ نتیجہ کے طور پر ان کی صحت جلد خراب ہو جاتی تھی
یہ بچے اپنے والدین اور بزرگوں کی بہت خدمت کرتے تھے۔ اور ساتھ
ساتھ کھیتوں میں ان کی مدد کرتے تھے۔ اس طبقہ کے لوگوں کی زندگی
بڑی الجھنوں میں گرفتار رہتی تھی۔ سخت محنت کرتے تھے لیکن غذا
اچھی نہیں ملتی تھی۔ بڑے لوگوں کے بچے محلوں میں پڑھتے تھے۔ یا ان
اسکولوں میں جایا کرتے تھے جو خاص ان لوگوں کے لیے بنائے جاتے
تھے۔ دولت مندوں اور رئیسوں کے کپڑے دریائے نیل میں دھوئے
جاتے تھے۔ ان لوگوں کے خاص دھوبی ہوتے تھے۔ لیکن غریبوں
کے کپڑے ان کی عورتیں اپنے ہاتھوں سے صاف کرتی تھیں۔ اونچے
طبقہ میں گوشت اور شراب عام طور پر پیتے تھے نیچے طبقہ کے لوگوں کو یہ چیزیں
نصیب نہیں تھیں۔ یہ لوگ روٹی اور پانی کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں
کھاتے پیتے تھے۔ روٹی عام غذا تھی۔ اونچے طبقہ میں جو روٹیاں بنتی
تھیں وہ نیچے طبقہ کی روٹیوں سے مختلف ہوتی تھیں۔ اونچے طبقہ
میں روٹی کی شکل کیک کی ہو جاتی تھی۔

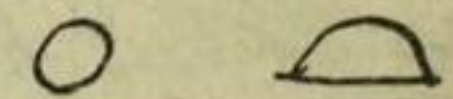

دعوتوں میں یہی روٹیاں یوں نکھر جاتی تھیں

مچھلیاں خوب کھائی جاتی تھیں۔ نیچے طبقہ کے لوگ مچھلیاں مارتے
تھے۔ گائے اور بیل کے گوشت بھی ابال کر کھائے جاتے تھے۔

غریبوں نے اپنے معمولی شراب
خانے آباد کر رکھے تھے۔ بڑے لوگوں نے اپنے گھروں میں شراب خانے

کھول رکھے تھے۔ بادشاہ خدا کی طرف سے بھیجا ہوا انسان سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے اسکی بھی پرستش ہوتی تھی۔ یہ بھی عجیب بات تھی کہ بادشاہ خود بھی اپنی عبادت کرتا تھا۔ بادشاہ کے خیالات خدا کے خیالات سمجھے جاتے تھے۔ اور بادشاہ کے کام خدا کے کام تصور کئے جاتے تھے۔ اس بڑے خدا کی طرف یوں اشارے کئے جاتے تھے:۔

بہت بڑا خدا

عوام کی بہبودی کا خیال رکھنے والا خدا 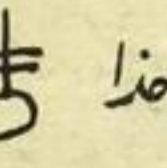

کائنات کا خالق 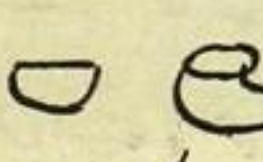

عبادت گاہیں خوب تعمیر ہوتی تھیں لیکن عبادت گاہوں میں اینٹ نہیں لگائی جاتی تھی۔ پتھر لگائے جاتے تھے۔ مصریوں کو اس کا یقین تھا کہ ایک زمانہ میں یہ زمین اور یہ آسمان نہیں تھے۔ اور ان دیوتاؤں کا بھی کہیں وجود نہیں تھا۔ مصریوں کے دیوتاؤں کی تعداد تین ہزار سے کم نہیں ہے۔ ہر گاؤں ہر شہر اور ہر قصبہ کے دیوتا مختلف ہوتے تھے۔ بہت کم، ایسے دیوتا تھے جو ایک شہر یا گاؤں میں رہنے کے بعد دوسرے شہر یا گاؤں میں مقبول نہیں تھے۔ مصریوں نے ان سارے دیوتاؤں کو اپنے خیالوں سے پیدا کیا تھا۔ اور ان دیوتاؤں کی صورتیں مصریوں کی صورتوں سے ملتی جلتی تھیں۔ ان کے دیوتا کھاتے پیتے بھی تھے۔ انسانوں کی طرح کپڑے بھی پہنتے تھے۔ ان کے جذبات اور احساسات انسانوں سے مختلف نہیں تھے۔ ان کے جذبات وہی تھے جو مصریوں کے تھے۔ وہ بھی کسی چیز کے متعلق اسی طرح سوچ سکتے تھے۔ جس طرح انسان سوچتا

ہے۔ وہ بھی کسی چیز کو اسی طرح محسوس کر سکتے تھے جس طرح انسان محسوس کر سکتا ہے۔ غرض مصریوں نے اپنی شکل اور خیالات اور جذبات سے الگ دیوتاؤں کی تخلیق نہیں کی تھی۔ ہاں بعض دیوتا ایسے تھے جو انسان کی فطرت اور صورت سے الگ تھے۔ مثلاً مگر مچھ دیوتا، سانڈ دیوتا، مینڈک دیوتا، وغیرہ، جانوروں کا احترام ان کے یہاں بہت تھا۔ اسکا ثبوت یہ ہے کہ جانوروں کی شکل کے دیوتا ہوتے تھے۔ جن کی پرستش ہوتی تھی۔ ـــــ مصریوں کی تصویروں میں ان کی زندگی کی جھلک، ان کی نفسیات کی جھلکیاں، ان کی تہذیب کی ادائیں اور ان کے ماحول کی گہری پرچھائیاں ہر جگہ موجود ہیں۔ ہر لفظ ہر تصویر اپنے اندر ان کی نفسیات اور ان کے شعور کا عکس رکھتی ہے۔ مصریوں کے جینے کے طریقوں اور سوچنے کے انداز نے ان کی زبان پر نہایت ہی گہرا اثر ڈالا تھا۔ بدآری کی کھدائی سے جو سامان برآمد ہوئے ہیں ان میں مٹی کے ایسے برتن بھی ہیں جن پر قدیم مصری تحریریں موجود ہیں۔ ان سے اسکا بھی پتہ چلتا ہے کہ پانچ ہزار سال قبل نیل کی وادی میں شکاری انسانوں کے قبیلے آباد تھے۔ کاشتکاری بھی ہوتی تھی۔ اس لئے کہ دہانہ کے قریب کے علاقے زرخیز تھے۔ مٹی کے ان برتنوں پر شام کے برتنوں کا اثر ملتا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں کے لوگوں کا گہرا تعلق شام کے لوگوں سے بھی تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ممکن ہے یہ برتن خالص شام کے ہوں۔ اور ان میں شام سے زیتون کا تیل آتا ہو۔ اس طرح دونوں ممالک کے تجارتی تعلقات پر بھی روشنی پڑتی ہے (پروفیسر برسٹڈ اس سے متفق ہیں۔ وہ یہ کہتے

ہیں کہ قدیم مصریوں کا تعلق شمالی افریقہ اور مغربی افریقہ کے عوام سے تھا۔ یعنی گلاّ، سومال، بیگا اور دوسرے قبیلوں سے ان کا گہرا تعلق تھا۔ اور ایشیا کے لوگوں کی بار بار آمد سے ان کے کردار پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ افریقہ کے باشندوں پر ان کے نقوش جم گئے۔ اور ان کی زبان بھی اچھی طرح متاثر ہوگئی۔ مصری زبان کی ابتدائی حالت کے تجزیئے کے بعد یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ بعد میں اس پر جو ایشیائی اثرات ہوئے ہیں ان سے یہ زبان متاثر ہو کر اپنے بعض راہوں کو چھوڑ چکی تھی۔ ان کی زبان کی ساخت پر بھی بہت اثر ہوا پروفیسر برسٹڈ کا خیال ہے کہ تین ہزار سال تک افریقہ کے لوگوں سے مصری لوگوں کا تعلق اس کے باوجود قائم رہا۔ پروفیسر صاحب کے اس خیال کی تائید چند قدیم دکوینٹ سے ہو جاتی ہے۔ ایشیا کے لوگوں سے مصر کے عوام کے جو تعلقات رہے ہیں۔ اس پر پروفیسر برسٹڈ خاموش ہیں۔ وہ صاف طور پر اس سلسلہ میں کچھ نہیں کہتے۔ وہ مصر کے لوگوں کا تعلق شمالی اور مغربی افریقہ سے بتا کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس سلسلہ میں ماہرین لسانیات کو کبھی کامیابی نہیں ہوگی۔ ایشیا کے لوگوں سے مصر کے لوگوں کے تعلقات کس طرح اور کیوں قائم ہوئے تھے۔ نیل کی وادی پر خانہ بدوشوں کا بھی قبضہ ہوا۔ وہ خانہ بدوش بھیڑ اور بکریاں ہانکتے تھے۔ انہوں نے ان لوگوں کو کافی پریشان کیا جو دہانہ کے قریب زرخیز علاقوں میں آباد تھے۔ اور شام سے تجارت کرتے تھے۔ ان خانہ بدوشوں نے ان کی کھیتی باڑی چھین لی۔ ان کے سرداروں نے بڑے مظالم ڈھائے۔ خون کرنا ان کی شان تھی۔ اسی وجہ سے

وہ سردار سُرخ رنگ کی ٹوپیاں پہنتے تھے۔ قدیم نیل کی وادی میں جو تمدن تھا اس پر بہت سارے دوسرے ملکوں کے عوام کی تہذیب و تمدن کا اثر تھا۔ عربوں، یہودیوں، ہندوستانیوں اور شام اور فلسطین کے لوگوں کے اثرات سے کسی کو انکار ہو سکتا ہے۔ دریائے نیل کی وادی سے قدیم مصریوں کی جو لاشیں ملی ہیں ان کا معائنہ ہنوز جاری ہے۔ ہم سمجھتے تھے کہ ان کی تحقیق کے بعد اور بہت ساری باتیں معلوم ہوں گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس سلسلہ میں ابھی تک کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہے۔ جب تک اس سلسلہ میں کامیابی نہ ہو یہ کہہ دینا کہ مصریوں کی نسل اور افریقہ کے نیگرو کی نسل ایک تھی۔ غلط ہے۔ قدیم انسانی لاشوں سے بہت ساری باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔ قدیم مصریوں کی قبروں سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم مصری سفید چمڑے کے انسان نہیں تھے۔ موت کا تنا اور کپڑا بننا جانتے تھے۔ عورتیں لمبے چوغے پہنتی تھیں۔ زیورات میں انگوٹھی اور ہاتھی دانت اور قیمتی پتھروں کے دوسرے زیورات عام تھے۔ بال سنوار کر ان میں کنگھی رکھنے کا قاعدہ تھا آنکھوں میں حسن پیدا کرنے کے لئے کاجل جیسی کوئی چیز لگائی جاتی تھی اور ساتھ ساتھ چہرہ پر مختلف قسم کے مصالحہ لگائے جاتے تھے۔ جانوروں میں بھیڑ، بکریاں، اونٹ، کتے اور گدھے پالے جاتے تھے۔ قدیم مصر کی ان دو ریاستوں کے متعلق (ایک وادی نیل کی ریاست) اور دوسری وسطی مصر کی ریاست) ابھی تک تشفی بخش معلومات فراہم نہیں ہو سکے ہیں۔ ان دو ریاستوں کی جنگوں کے متعلق ہمیں کچھ زیادہ معلوم نہیں۔ ان ریاستوں کے سرداروں، نامور جنگجو سپاہیوں

اور ان کے تمدن کی مکمل حالت کو ابھی تک سمجھا نہیں گیا ہے۔ یہ تاریخ کے وہ باب ہیں جو ابھی تک ہم سے پوشیدہ ہیں۔ اتنا ضرور پتہ چلا ہے کہ دہانہ کے قریب کی ریاست کے سردار سرخ ٹوپی پہنتے تھے۔ ٹوپی پر ایک تتلی کی تصویر ہوتی تھی۔ ریاست کے خزانہ کو سرخ محل کہتے تھے۔ سرخ ان کا پسندیدہ رنگ تھا۔ یہ واقعی ہماری بہت بڑی بدنصیبی ہے کہ وادئ نیل کی یہ ریاست دریائے نیل کے قریب تھی۔ نیل کے پانیوں اور مٹی کی وجہ سے اگر کچھ چیزوں کی دریافت کی امید تھی وہ ختم ہو گئی۔ اور شاید ہم انہیں کبھی حاصل نہ کر سکیں گے۔ تاریخ دان کہتے ہیں کہ وادی کے نیچے کی تہذیب اوپر کی تہذیب سے ترقی یافتہ تھی۔ اس کا ایک بہت بڑا ثبوت یہ بھی ہے کہ پینتالیس ہزار سال قبل مسیح دہانہ نیل کے لوگوں نے کلنڈر بنائی تھی۔ جس میں تین سو پینسٹھ دنوں کا ایک سال مانا گیا تھا۔ یہ کتنی بڑی بات تھی۔!! کلینڈر کی دریافت سے اس کا پتہ صاف طور پر چلتا ہے کہ پینتالیس ہزار سال قبل مسیح مصریوں میں لکھنے پڑھنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ انہوں نے لکھنے کا کوئی خاص طریقہ معلوم کر لیا تھا۔ ان کے ہزاروں سال بعد مصر کے پانچویں خاندان نے قدیم مصریوں کی تحریک کی بناء پر شمالی اور دکنی مصر کے قدیم بادشاہوں کی ایک فہرست تیار کی تھی۔ ماہرین کہتے ہیں کہ ہزاروں سال بعد کی یہ محنت بغیر قدیم مصریوں کی تحریروں کی بنیاد کے کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ پہلے خاندان کی تحریروں سے بھی اسکا اندازہ ہو جاتا ہے کہ اسکی تحریریں نئی نہیں تھیں۔ ان تحریروں کے پس پردہ کچھ قوتیں کام کر رہی تھیں۔ ظاہر ہے یہ قوتیں شمالی اور جنوبی مصر کی تصویروں

(Hieroglyphs) سے مل رہی تھیں (باوجود بہت کوششوں کے
قدیم شمالی اور جنوبی مصر کے ان سرداروں اور بادشاہوں کی قبروں کا پتہ نہیں
چل سکا ہے۔ جن کا زمانہ چار پانچ ہزار قبل مسیح تھا۔ اگر ان کی قبروں کا پتہ چلتا
تو ضرور ان کی قبروں سے ان کی تحریریں بھی مل جاتیں۔ جس طرح دوسری قبریں
سے تحریریں نکلی ہیں اور جن سے ہم نے قدیم مصر کے حالات کو بہت کچھ سمجھا ہے)
مغربی ماہرین ابھی تک اس سلسلہ میں کسی خاص فیصلہ پر نہیں آسکے ہیں کہ مصر
کی تہذیب قدیم تھی اور اسکا اثر بابل کی تہذیب پر ہوا تھا۔ کچھ ماہرین
یہ کہتے ہیں کہ بابل کی تہذیب کا گہرا اثر مصر کی تہذیب پر ہوا تھا۔ یہ حقیقت
ہے کہ دونوں تہذیبوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ دونوں تہذیبیں ایک دوسرے
سے متاثر ہوتی رہی ہیں۔ ایک دوسرے پر اپنے اثرات چھوڑتی رہی ہیں
زندگی کے ہر شعبہ پر اثر ہوتا رہا ہے۔ ان دونوں قدیم تہذیبوں نے یورپ
کی تہذیب پر گہرا اثر ڈالا۔ یورپ کی قدیم تہذیب پر ایک طرف سمیرین اثرات
ہیں اور مسوپٹامیا کی تہذیب کا گہرا رنگ ہے۔ اور دوسری طرف قدیم
مصری تہذیب کی گہری پرچھائیاں ہیں۔ ان ساری باتوں کے باوجود مغرب
کے ماہرین کا یہ خیال غلط ہے کہ قدیم مصری تہذیب و تمدن اور قدیم بابلی
تمدن کے اثرات ویدک آریاؤں، دراوڑی اور چینی اور جاپانی تہذیب
پر پڑے تھے۔ مغربی ماہرین اس سلسلہ میں شعوری اور غیر شعوری طور پر اسکی
کوشش کرتے رہے ہیں کہ کسی صورت سے یہ بتایا جائے کہ ایشیا، کی قدیم
تہذیب و تمدن پر مصر، بابل اور قدیم افریقہ کے لوگوں کے اثرات تھے
چین اور ہندوستان کی قدیم تہذیب کے متعلق بھی وہ یہی کہتے رہے
ہیں۔ ان قوموں کا گہرا اثر مانتے ہیں۔ اس کے لئے وہ ویدی آریاؤں کی

تہذیب میں مصری تہذیب کے اثرات ڈھونڈتے ہیں۔ بابل اور قدیم افریقہ کے لوگوں کے رنگ و روپ تلاش کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ان کی کوشش بونی سی ہیں۔ ایشیاء کو ہر سلسلہ میں مغرب کا محتاج بنا کر دکھانے کا جذبہ بھی کارفرما رہتا ہے۔ مصر کی قدیم تہذیب کا تجزیہ واقعی دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔

اگر مصر کی قدیم تہذیب کا ایمانداری سے تجزیہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ مصر کی تہذیب و تمدن پر ہندوستان کا گہرا اثر ہے۔ ہندوستان کی قدیم تہذیب کے عناصر وہاں صاف طور پر نظر آتے ہیں۔ مصر اور نیل کے نام پر بھی سنسکرت کا اثر ملتا ہے۔ ہومر کی تحریروں میں پہلی بار مصر کا نام "آئی گائپ ٹس" (Aigyptos) ملتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس لفظ کا کوئی تعلق مصری اور یونانی زبانوں سے نہیں ہے۔ مغرب کے ماہرین بھی اس سلسلہ میں خاموش ہیں۔ جب ہماری نگاہیں ہندوستان کی طرف جاتی ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سنسکرت میں اس قسم کا ایک لفظ ہے "آئی گائپ ٹوس" ممکن ہے سنسکرت لفظ "اگپتا (a gupta) سے بنا ہو۔ (اگپتا گپ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں حفاظت) اگپتا کے معنی "ہر طرف سے محفوظ" کے ہیں۔ ممکن ہے مصر کو نیل کے پانیوں سے محفوظ سمجھا گیا ہو۔ اور ایسا نام ہندوستانیوں نے دیا ہو۔ نیل کے لئے یونانی نام "نیلوس" (Neilos) تھا۔ اس لفظ کا بھی کوئی تعلق قدیم یونانی یا قدیم مصری زبان سے نہیں ہے مصر کا نہایت ہی قدیم نام "تاپی" یا "اور" تھا۔ عبرانی زبان (Hebrew) میں بھی "نیلوس" کی حقیقت کا کوئی علم نہیں ہوتا۔ سنسکرت میں "نیلا" لفظ ہے۔ نیل کے پانیوں کے رنگ کی مناسبت سے یہ نام مل سکتا ہے (او ڈیبی

(odyssey) میں بھی نیل کا لفظ ملتا ہے)

مصر کا ایک قدیم نام "کامت" (Kamit) بھی ہے۔ اس کے معنی بھی ہیں "کالا ملک" یا "کالی زمین"۔ کہا جاتا ہے کہ چونکہ قدیم مصریوں کی زرخیز زمین کا رنگ سیاہ تھا۔ اس لئے اسے "کامت" بھی کہتے تھے۔ سنسکرت کے "کو" (کالا) سے اس لفظ کا تعلق ہو سکتا ہے۔ سنسکرت میں "مرت" مٹی کو کہتے ہیں۔ "کامت" کا "مت" ممکن ہے "مرت" سے بنا ہو۔ ان باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مصر کی تہذیب پر ہندوستانیوں کے اثرات تھے۔ مصر میں ہندوستان کے اس حصہ کے لوگ گئے تھے جن کی زبان سنسکرت تھی۔ بہت ممکن ہے وہ لوگ مالا بار کے رہنے والے ہوں۔ اس وقت مالا بار کے ساحل پر پانڈے آباد تھے۔ مصر میں وہی پانڈے "پنت" "پرٹ" یا "پنڈ" ہو گئے ہیں۔ مصر میں "پنت" کی تہذیب کے جو اثرات ہیں۔ ان سے کسی کو انکار نہیں ہے۔ مغرب کے ماہرین بھی اسکا اقرار کرتے ہیں کہ مصر میں پنت لوگوں کے اثرات گہرے تھے۔ یہ لوگ مصر کے مشرق سے آئے تھے۔ (مالا بار ساحل بھی مصر کے مشرق میں ہے) مصری خدا کے متعلق یہاں تک کہنے لگے تھے کہ خدا صبح کا مقدس ستارہ ہے جو "پنتوں" کی زمین سے طلوع ہوتا ہے۔ قدیم مصر کے مذہب پر بھی رگ وید کے مذہب کا گہرا اثر ملتا ہے۔ مصریوں کے یہاں آفتاب کے دیوتا کا نام "ہورس" ملتا ہے۔ سنسکرت میں ایک لفظ "سورجن" ہے (ممکن ہے جس سے یونانی لفظ "سیریوس بھی بنا ہو) سنسکرت کے اس لفظ کے پہلے حرف کو غلط طور پر مصر میں بولا گیا ہو اور "س" "ہ" بن گیا ہو۔ ایسے بہت سارے الفاظ ملتے ہیں جو غلط بولنے کی وجہ سے یا جغرافیائی

حالات سے مجبور ہونے کی وجہ سے اپنی صورت بدل چکے ہیں۔ مصری جسے رات کا آفتاب کہتے ہیں (جس میں روشنی نہ ہو) اسکے لئے ایک لفظ "ادیترے" ([illegible]) لاتے ہیں۔ سنسکرت کے لفظ "اے سر جس" سے اسکا تعلق معلوم ہوتا ہے۔ سنسکرت کے اس لفظ کے معنی ہیں وہ سورج جس میں آفتاب کا جلال نہ ہو۔ رگ وید میں شب کے اس آفتاب کو بنیاد کی دنیا میں کھویا ہوا آفتاب کہا گیا ہے۔ (رگ وید ۱۰ ـ ۸۶ ـ ۲۱) مصریوں کے مذہب پر ہندوستان کے دیوتاؤں کے رنگ وروپ اور روح کا گہرا اثر ہے۔ پہاڑوں، درختوں موسموں، ہواؤں، طوفانوں ہر کے لئے دیوتا موجود ہیں۔ انسان کے چاروں طرف بہت سارے مافوق الفطرت عناصر ہر وقت رہتے ہیں۔ کچھ عناصر ان کے دوست ہیں۔ کچھ ان کے دشمن۔ کچھ مافوق الفطرت عناصر ایسے ہیں جو انسان کی حفاظت کرتے ہیں۔ اور کچھ ایسے ہیں جو انسان کی غلطیوں پر نقصان پہنچاتے ہیں۔ مختلف قسم کی بیماریاں لاتے ہیں۔ اور موت کی دیوی کو ساتھ رکھتے ہیں۔ آسمان دونوں ملکوں کے لوگوں کے لئے ایک سمندر رہا ہے۔ آفتاب دونوں ملکوں کے لئے ہر صبح ایک گائے کے بچے کی طرح پیدا ہوتا رہا ہے۔ (کوئی عورت بچہ پیدا کرتے وقت جو تکلیف اٹھاتی ہے وہی تکلیف صبح کو ہوتی ہے)۔ آفتاب صبح کی اولاد ہے جو اسی طرح پیدا ہوتا ہے جس طرح کسی عورت کے بدن سے بچہ پیدا ہوتا ہے۔ یا کوئی گائے بچہ دیتی ہے۔ مصر اور ہندوستان دونوں کے لئے "زمین" ایک انسان کی طرح لیٹی رہی ہے۔ جانور جسم پر چلتے رہتے ہیں۔ اور انسان سانس لیتا رہا ہے۔

مصر، عوام کا سیکی دنیا کو ایک تجزیدی اور تکنیک کے

لئے مٹی کی تختیاں بھی فراہم کیں۔ روشنائی اور قلم کی بھی اہمیت کا گہرا احساس ہوا ہے۔ شاہی فرمان ایک نہایت ہی اچھی مٹی کی تختی پر لکھا جاتا تھا۔ ہر شاہی فرمان کی تختی کا وزن چار سیر سے کم نہیں ہوتا تھا۔ ان کی تحریروں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فن میں حسن کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ تعلیم کی اہمیت اسلئے تھی کہ اس سے انسان سماج میں کوئی اچھا مقام حاصل کر لیتا تھا۔ فطرت اور ملک کے باہر کے حالات کو سمجھنے کی کوشش وہی لوگ کرتے تھے جو خاص چیزوں اور باتوں کی تلاش میں رہتے تھے۔

اس وقت ادب کی طرف لوگوں کا ذہن زیادہ نہیں گیا۔ اس لئے کہ سماجی حالات کچھ ایسے تھے جن میں ادبی تخلیق کی اہمیت کچھ نہ تھی۔ اسکی کوشش ہوتی تھی کہ زندگی کے تجربوں سے حاصل کی ہوئی ایسی باتیں جن سے نئی نسل کو کچھ فائدہ ہونے کا امکان تھا۔ جمع کی جائیں۔ دربار کے درویش، وزراء اور پروہت مقولوں، کہاوتوں، ضرب المثل، لطیفوں میں ان باتوں کو تبدیل کر دیتے تھے۔ یہ مقولے اور کہاوتیں لکھ کر تقسیم بھی ہوتی تھیں پانچویں خاندان کی جو تحریریں ملی ہیں ان میں بہت ساری حقیقتیں ہیں لیکن ان کی کوئی ادبی صورت یا ہیئت نہیں ہے۔ کسی خاص شخص کی عظمت کی داستان سننے اور لکھنے کی خواہش آہستہ آہستہ بڑھی۔ لوگوں کی یہ خواہش ہوئی کہ ان کے درمیان جو بڑے لوگ ہیں ان کے متعلق پڑھے لکھے لوگ، پروہت اور وزراء وغیرہ کچھ لکھیں اور یہ بتائیں کہ کسی بڑی شخصیت کا سماج پر کیا اثر ہوتا ہے۔ یہ بات مرنے کے بعد ہوتی رہی۔ کسی بڑے انسان کی موت کے بعد اسکے متعلق کچھ باتیں جن کا تعلق براہِ راست اسکی زندگی

سے ہوتا تھا۔ لکھی جاتی تھیں۔ یہ باتیں مرنے والوں کی قبروں پر لکھی جاتیں۔ ان تحریروں کے جملے چھوٹے چھوٹے ہوتے تھے۔

ایسی بہت سی

قبروں کے کتبے دستیاب ہوئے ہیں جن پر ایک سی باتیں تحریر ہیں ہر بڑی شخصیت کی عظمت کی داستان ایک ہو جاتی تھی۔ لکھنے والے چونکہ مقولوں اور کہاوتوں کو استعمال کرنے کی کوشش کرتے تھے لہذا ہر جگہ ایک سی بات ہوتی تھی۔ بڑی شخصیتوں کے متعلق کچھ بھی لکھنے کے قبل لکھنے والے ان شخصیتوں کا مطالعہ نہیں کرتے تھے۔ چند خوبیوں کے بیان ہی پر اکتفا کرتے تھے۔ مرنے والوں کے کردار کا مطالعہ کئے بغیر لکھنا ہی یہ ظاہر کرتا ہے کہ بات نہیں بنتی ہوگی۔ ان تحریروں میں انفرادیت کی تلاش فضول ہی ہے۔ ایک ہی قسم کی کہانی اور ایک ہی قسم کے فرسودہ قصے ہر جگہ ہیں۔ کچھ مذہبی گیت کے رنگ کی چیزیں بھی ملی ہیں انہیں قدیم مصر کی قدیم شاعری کا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔

سنہ ۱۷۹۶ء میں جب نپولین نے مصر کی وادی میں اپنے سپاہیوں سے یہ کہا تھا کہ چالیس صدیاں تم لوگوں کو دیکھ رہی ہیں تو اس نے غلط نہیں کہا تھا۔ قدیم مصر آج بھی سامنے ہے اپنی بہت ساری رعنائیوں اور عظمتوں کے ساتھ۔ مصر کے اہراموں (Pyramids) نے قدیم انسان کی زندگی کے انگنت باب کھول کر رکھ دئے ہیں۔ بعض تاریخ دان کہتے ہیں کہ تین ہزار سال قبل مسیح نیل کی تمام وادی ایک ہی شخص کی حکومت میں آگئی تھی۔ اس وقت وادی کی سماجی حالت پہلے سے بہتر تھی۔ لوگ بہت اطمینان سے زندگی گذار رہے تھے۔ بادشاہ کی عزت بہت زیادہ تھی۔ اسکی آواز خدا کی آواز

سمجھی جاتی تھی۔ فراعنہ کے دوسرے خاندان نے صحیح معنوں میں پہلا اہرام (Pyramid) بنوایا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ فراعنہ کے ایک فرعون خاسے خموئی کے لڑکے نزدسر نے اپنے وزیر اور استاد آم ہوتپ کے مشورہ سے یہ پہلا اہرام بنوایا جس میں ۴۸ ستون لگائے گئے۔ ہر ستون کی گولائی تین فٹ، اور اونچائی ۱۰ فٹ رکھی گئی۔ اس میں سیڑھیاں بھی لگائی گئیں اور اس کے چاروں طرف دیواریں بھی اٹھائی گئیں۔ دیواروں پر تصویریں نہیں۔ کچھ تاریخ دان اسے اہرام قبول نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ پہلا اہرام وہی ہے جو چوتھے خاندان کے بادشاہ "خوفو" (Khufu) نے دو ہزار نو سو برس قبل مسیح بنوایا تھا۔ جب فراعنہ کے دوسرے خاندان کا یہ اہرام ہمیں اور بھی قدیم باتیں بتانے کو تیار ہے تو پھر کیوں اسکے وجود سے انکار کیا جائے۔ اس اہرام میں اہرام کی بہت ساری باتیں موجود ہیں۔ پھر اسے اہرام (Pyramid) کیوں نہ کہا جائے خوفو نے جو اہرام بنوایا وہ سب سے عظیم اہرام ہے۔ یہ اہرام دو ہزار نو سو سال قبل مسیح بنایا گیا تھا۔ اس میں خوفو دفن ہے۔ اس عظیم اہرام کا ہر پہلو ۷۵۵ فٹ لمبا ہے۔ تینوں حصے برابر ہیں۔ ذرہ برابر کا بھی فرق نہیں ہے۔ اہرام کی اونچائی ۴۸۰ فٹ ہے۔ مصر کے ان اہراموں میں بادشاہوں کو دفن کیا جاتا تھا۔ غریبوں کے اہرام معمولی ہوتے تھے۔ ان میں مصریوں کی فنکاری اور ان کی تخلیقی قوتیں ہر جگہ کارفرما نظر آتی ہیں۔ مصر کے یہ اہرام واقعی قدیم انسانوں کی تہذیب و تمدن سے قریب کر دیتے ہیں اور بہت سارے اسرار و رموز کھولتے ہیں۔ مصریوں میں تعلیم زیادہ نہیں تھی۔ وہ حساب کے ماہر نہیں تھے۔ اس کے باوجود پتھروں کی تراش و خراش، انکا

وزن، پتھروں کے نقش و نگار اور مجسموں کے وقار میں ان کی محنت کا حسن اور ان کے ذہن کے توازن کا پتہ چلتا ہے۔ چار سو پچاس فٹ پر دو ٹن کے بلاک رکھنے کے قبل انہیں بنیاد کی مضبوطی اور استحکام اور نہ جانے کتنی اور باتوں کا خیال رکھنا پڑا ہوگا۔ وہ مزدور بھی کتنے محنتی تھے جو اہرامول کی تعمیر کرتے تھے۔ مزدوروں کی محنت معمولی نہیں تھی۔ اہراموں کو دیکھکر اسکا اندازہ پہلی نظر میں ہو جاتا ہے۔ اسکی تعمیر میں جو ہاتھ کام کر رہے تھے۔ اسمیں لگن تھی، سچائی تھی اور ساتھ ساتھ عقیدت تھی۔ کسی بادشاہ کے حکم سے یا کسی حکومت کے زور سے ایسی عمارتیں تعمیر نہیں ہوتیں جب تک کہ اس میں مزدوروں کا خونِ جگر شامل نہ ہو اہراموں میں مزدور سالہا سال کام کرتے تھے اور ان کی محنت میں کمی نہیں ہوتی تھی۔ اسکی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ بادشاہوں کے لئے مقبرے بناتے تھے۔ اور ان کی نگاہوں میں بادشاہوں کی بہت عزت تھی۔ وہ بادشاہ کی باتوں کو خدا کی بات سمجھتے تھے۔ بادشاہوں کی پرستش کرتے تھے۔ اس وقت کے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ موت کے بعد اگر ان کا بادشاہ آرام سے قبر میں رہے گا تو انہیں بھی ثواب ملیگا۔ اور وہ دنیا میں خوشی کی زندگی بسر کریں گے۔ ان اہراموں میں اجتماعی محنت کے کرشمے ہر جگہ نمایاں ہیں۔ جیومیٹریائی آرٹ کی پہلی صورت یہیں نظر آتی ہے۔ مختلف زاویوں، حاشیوں اور دائروں میں ماحول کی حقیقتیں پوشیدہ ہیں۔ جب فنکار کی انفرادیت سماجی حقیقتوں کے احساس کو سمجھ لیتی ہے تو جیومیٹریائی آرٹ میں جان سی آجاتی ہے۔ آج کل نقادوں کا ایک طبقہ جیومیٹریائی آرٹ کو خالص داخلی آرٹ ثابت کرنیکی کوشش میں ہے۔ ظاہر ہے کہ جیومیٹریائی

آرٹ کو صرف داخلی آرٹ (subjective art) نہیں کہا جا سکتا
۔ اس آرٹ کے سانچے میں جہاں داخلی خواہشیں اور کیفیتیں ہوتی ہیں
وہاں خارجی خواہشیں اور کیفیتیں بھی ڈھالی جاتی ہیں۔ یہ کہنا بالکل غلط ہو گا
کہ مصر کی عمارتوں پر ابھرے ہوئے خطوط، زاویئے اور دائرے خالص داخلی خواہشات
کی تصویریں ہیں۔ اس لئے ان خطوں اور ان زاویوں میں ہمیں سماجی ماحول
کی بھی پرچھائیاں اچھی طرح نظر آتی ہیں۔ جو لوگ مصر کی ان عمارتوں کے نقوش
کو تاریخی پس منظر میں دیکھتے ہیں انہیں بہت ساری باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔
خارجی زندگی کی کشمکش کو ان عمارتوں کے الجھے ہوئے زاویوں اور دائروں
میں اچھی طرح دیکھا جا سکتا ہے۔ ان اشاروں (symbols) میں خارجی
قدریں بھی چمکتی ہیں۔ اشاریت کا تعلق خارجی زندگی سے بہت گہرا ہے۔
خارجی زندگی کی وہ بہت ساری باتیں جو صاف طور پر پیش نہیں ہوتی ہیں
اشاروں میں بیان کی جاتی ہیں۔ اس سے انکار ممکن نہیں کہ جیومیٹریائی آرٹ
میں زندگی کے بہت سارے اسرار و رموز ہوتے ہیں۔ جیومیٹری سے قریب
ہو کر فن میں دائرے، زاویے، متوازی خطوط اور وتر (Diagonals) شامل
ہو جاتے ہیں تو انسانی ذہن پر اسکے اثرات رقص اور مصوری سے کم نہیں ہوتے
مثلاً کسی پتھر کے مجسمے پر مزورت کے مطابق جب کوئی دائرہ گھوم جاتا ہے
تو حیرت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اس میں بھی رقص کا لطف مل جاتا ہے
فن مصوری، فن بت تراشی اور فن تعمیر میں جیومیٹری سے بہت کم کام لئے
گئے ہیں۔ ایک ہلکی سی لکیر میں حیات کے ایک گوشہ کو رکھ دیا گیا ہے
چند الجھے ہوئے زاویوں میں انسانی نفسیات کو خوبصورتی کے ساتھ پیش
کر دیا گیا ہے۔ چند خطوط سے مرد اور عورت کے جنسی تعلقات کو حسن و خوبی

سے بتا دیا گیا ہے۔ اور چند دائروں سے معاشی زندگی کی کشمکش، حیات کی تلخیاں، فرار، خاموشی، سکوت، جدوجہد کے انداز سب کچھ بتا دئے گئے ہیں۔ مصر کے ابوالہول کے نقوش میں فرار کے رجحانات، ماحول کو برداشت نہ کرنے کی صلاحیت، زندگی کے نشیب و فراز سے گھبراہٹ اور جدوجہد سے دور رہنے کا انداز، بادشاہوں سے عقیدت، ڈر، خوف، خلوص، محبت، جولانی لگن، احساس ذمہ داری سب کچھ دیکھا جا سکتا ہے۔ اشاریت یا سمبل ازم سے ہمارا واسطہ ہر وقت رہتا ہے۔ خیالات کے ارتقا اور دنیا کی وسیع وادی میں اسکی بنیاد ہر جگہ مضبوط ہے۔ ہم اشاروں اور سمبلس سے الگ رہ کر سانس نہیں لے سکتے۔ زبان بنیادی طور پر اشارہ ہی تو ہے۔ انسان کے خیالات احساسات، خواہشات اور جذبات کا ۔ اگر ان سے خیالات ہٹا دئے جائیں تو الفاظ کی کیا اہمیت رہ جائے گی۔ آرتھر سائمنس (Arthur Symons) نے کہا تھا کہ اشاریت کی ابتدا اس وقت ہوئی تھی۔ جب انسان کی زبان سے پہلا لفظ نکلا تھا۔ انسان اسکے سہارے اپنے شعور اور غیر شعور کے ہنگاموں کو دیکھتا ہے۔ زبان انسان کو اس پر مجبور کرتی ہے کہ وہ اشاروں اور سمبل میں سوچے۔ قدیم مصر کے فن پر اشاریت کا گہرا رنگ ہے۔ قدیم مصریوں کی تعمیر شدہ عمارتوں کے جو نقوش نظر آتے ہیں ان میں ان کی محنت دیکھکر سخت حیرت ہوتی ہے۔ اہراموں میں لاشوں کے ساتھ اور بھی بہت ساری چیزیں رکھی جاتی تھیں۔ یہ چیزیں ضروریات زندگی کی چیزیں ہوتی تھیں۔ غریبوں کی قبروں میں مٹی کے برتن رکھے جاتے تھے۔ قدیم مصریوں کا خیال تھا کہ مرنے کے بعد جب لاش دفن کر دی جاتی ہے تو روح اس وقت تک بار بار لاش میں آتی ہے جب تک کہ لاش اچھی حالت میں رہتی ہے۔ وہ جسم کو پائدار

بنانے کے لئے مختلف قسم کی دوائیاں تیار کرتے تھے۔ ممی بنانے کا بھی رواج اسی وجہ سے ہوا ۔ آج بہت ساری لاشیں دستیاب ہوئی ہیں۔ ایک ہزار تین سو سال قبل مسیح کی ایک لاش ملی ہے۔ یہ لاش شاہ ٹوٹن خامن کی ہے۔ اسکی قبر سے بہت ساری چیزیں پائی گئی ہیں۔ قدیم مصری شاہی برتن صندوق، شاہی سونے کا تخت، سینڈل جن میں سونے لگے ہوئے ہیں۔ بہت ساری تصویریں، چھڑی، لکڑی کی کرسیاں جن میں ہاتھی دانت لگے ہوئے ہیں۔ اور دوسری چیزیں۔ یہ چیزیں اپنے ساتھ ایک ہزار تین سو سال قبل کی کہانیاں لیکر آئی ہیں۔ ان کی زبان خاموش ہے۔ ان کی خاموشی سے جو کچھ بھی جان لیا گیا ہو لیکن ان کی خاموشی نہ جانیں کتنی داستانیں چھپائے بیٹھی ہے۔ ہم جانتے ہیں یہ خاموشی ہمیشہ رہیگی اور بہت سی کہانیاں، قدیم انسانوں کی زندگی کی کہانیاں ہم کبھی سن نہ سکیں گے۔ بابل کی قدیم تہذیب میں لوگ مٹی کی تختیوں پر لکھتے تھے قدیم مصر میں اسکے ساتھ لکھنے کے لئے اور بھی چیزیں تھیں۔ پیپرس کا استعمال عام تھا۔ پانی سے روشنائی بنا کر پیپرس (ایک خاص قسم کے پودے سے تیار کیا ہوا کاغذ) پر لکھتے تھے۔ قدیم قبروں سے بہت سارے پیپری ریکارڈ (Papyri) دریافت ہوئے ہیں۔ یہ ریکارڈ لمبے لمبے پیپرس پر تیار کئے جاتے تھے (Records) لپٹے ہوئے رہتے تھے۔ اور انہیں کھولنے کے بعد کوئی بھی ریکارڈ دس پندرہ فیٹ سے کم نہیں ہوتا تھا۔ ایک ریکارڈ ساٹھ فیٹ لمبا ہے۔ جو دستیاب ہوا ہے۔ اس میں بہت ساری دواؤں کے نام ہیں۔ ایک ریکارڈ ایسا بھی ملا ہے جس میں حساب لکھے ہوئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے حساب (Arithmetic) کے قواعد بتائے گئے ہیں۔ جو ریکارڈ حاصل ہوئے ہیں۔ ان سے اس زمانہ کے حالات کا مکمل علم ہوتا ہے۔ پانچویں خاندان کا بانی اُمر کاف تھا۔ اس کے متعلق بہت

ساری دلچسپ باتیں مشہور ہیں۔ اس خاندان کا عہد ۲۷۵۰ ق۔م سے ۲۶۳۵ ق۔م تک ہے۔ چھٹے خاندان میں پیپی اول مشہور بادشاہ گذرا ہے۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ بہت ضدی اور بد دماغ تھا۔ اس کے وقت میں کچھ بدامنی پھیلی، لوگ بیزار ہوئے۔ پیپی اول کا ایک مجسمہ قاہرہ میں موجود ہے ۲۴۷۵ ق۔م میں چھٹے خاندان کا نام و نشان مٹ گیا۔

ساتویں خاندان کی حکومت میں مصر میں ہر طرف بےچینی پھیل گئی۔ لوگوں میں بادشاہوں کے خلاف بھی نفرت پھیلی۔ ہر طرف سے حملے شروع ہوئے بہت ساری عمارتیں تباہ ہوگئیں۔ بہت سارے اہراموں کا نام و نشان مٹ گیا۔ چھٹے خاندان (Sixth Dynasty) کے بعد بھی حالات بہتر نہیں ہوئے۔ شمالی مصر میں فلسطین کے قبائلی لوگ بس گئے۔ جنوب کی طرف سے حبشی آئے۔ اس وقت کے جو ریکارڈ حاصل ہوئے ہیں۔ ان میں شاعروں نے مصر کی حالت پر آنسو بہائے ہیں۔ ۲۱۶۰ ق۔م میں جب گیارہواں خاندان قائم ہوا ہے۔ اس وقت بادشاہ مینطوہوتپ کی کوششوں سے مصر کی حالت سنبھلی ہے اس درمیان میں جو خاندان آیا تباہ ہوا۔ مینطوہوتپ نے تیس سال حکومت کی اس حکومت میں کسانوں کی حالت پہلے سے بہتر ہوگئی۔ انہیں ٹیکس کم دینے پڑتے تھے۔ اسکے قبل تو کسانوں پر کافی ظلم ہوتا تھا۔ وہ جتنا پیدا کرتے تھے اتنا ٹیکس دیتے تھے۔ انہیں بادشاہوں، سرداروں، مندر کے پجاریوں اور پروہتوں سبھوں کو ٹیکس دینے پڑتے تھے۔ تاجروں کو بھی ٹیکس دینا ہوتا تھا لیکن جب تاجروں نے کشتیاں بنا کر اسکے سہارے اپنی تجارت کو فروغ دینا شروع کیا۔ تو ان کے لئے ٹیکس زیادہ نہیں رہا۔ کسان اپنی زمین کے علاوہ کہیں اور دوسری جگہ نہیں جا سکتے تھے۔ ان قدیم مصریوں کی جو تحریریں حاصل ہوئی ہیں ان میں

بھجن، موت پر نوحے، کتبے، چھوٹی چھوٹی کہانیاں، کہاوتیں، محاورے، بادشاہوں کی بہادری کے افسانے اور مزاحیہ باتیں شامل ہیں۔ ہیرن کہتے ہیں کہ قدیم مصری ادب کے زیادہ حصے سنجیدہ مضامین سے بھرے ہوئے ہیں۔ غم اور صدمے کی باتیں ہیں۔ ایک نظم میں ایک غریب انسان اپنی روح سے گفتگو کر رہا ہے کہ خودکشی کرنے کے لئے وہ تیار ہے۔ خودکشی کرنا اسکے لئے کہاں تک درست ہے۔ وہ موت کی آرزو بھی کرتا ہے۔ اور ہچکچاتا بھی ہے۔ اس غریب انسان کی روح خودکشی کی مخالفت کرتی ہے۔ روح کہتی ہے کہ مرنے کے بعد بھی اسکے جسم کو اچھی قبر نہیں ملیگی اس کے لئے کوئی کھانا نہیں لائے گا۔ اسکی قبر میں اچھی چیزیں نہیں رکھی جائینگی اس طرح وہ دوسری دنیا میں بھی تکلیف میں مبتلا رہے گا۔ مصر کی قدیم تاریخ کے گہرے مطالعہ کے بعد بھی اسکا پتہ نہیں چلتا کہ وہاں کوئی بڑا مفکر پیدا ہوا تھا یا نہیں۔ کسی بڑے شاعر اور ادیب کے وجود کا بھی علم نہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ قدیم مصری تہذیب کی تاریخ تین ہزار سال تک پھیلی ہوئی ہے۔ بارہویں خاندان میں کچھ کہانیاں ملتی ہیں جن میں بہت جان ہے۔ پنٹ (Punt) کے ملک (جسے پانڈوں کا ملک ہندوستان سمجھنا چاہیئے) سے تعلق رکھنے کی وجہ سے وہاں بہت سی کہانیاں آئیں۔ یہ کہانیاں اتنی مقبول ہوئیں کہ انہیں پتھروں اور جھنڈوں کے کپڑوں پر محفوظ رکھا گیا۔ اور قبروں میں مردوں کے لئے یہ کہانیاں رکھی گئیں۔ سندباد جہازی اور سانپ شہزادی کی بھی کہانیاں ملتی ہیں۔ اس وقت کی کہانیوں میں ماحول کی تصویریں بھی نظر آتی ہیں۔ قدیم مصر کی تحریروں کی طرح اسوقت بھی نثر اور نظم میں فرق محسوس نہیں ہوتا۔ اس خاندان کے بعد بھی جو خاندان آئے ان کے وقت میں زبان اور ادب کی ترقی ہوئی۔ جنگ کا بیان، رزمیہ نظمیں، گھریلو حالات کی تصویریں سب موجود ہیں۔ انیسویں خاندان میں مصری ادب اور زبان کی

کافی ترقی ہوئی۔ کہانیوں میں بہت جان آگئی۔ لوگوں میں مصری زبان سیکھنے کا رجحان پیدا ہوا۔ اس وقت کی کہانیوں میں علی بابا چالیس چور کی کہانی بھی پائی جاتی ہے نظم اور نثر میں کچھ فرق پیدا ہوا۔ نظم کی ہیئت بدلی۔ گیتوں کے لئے نئی صورتیں تیار کی گئیں۔ محبت اور عشق کے نغمے بھی ملتے ہیں جن میں تصورات کی دنیا میں شعراء جانے کہاں کہاں گھومتے رہے ہیں۔ مذہبی گیتوں کی طرف بھی شعرا کافی دھیان دے رہے تھے۔

یونانی زبان انڈو یورپین خاندان کی ایک زبان ہے۔ یونان کی قدیم زبان کا اب تک کوئی پتہ نہیں چل سکا ہے۔ ہیومرک نظموں سے قدیم ریکارڈ، قدیم اسلوب، ہیئت اور قدیم محاوروں اور تشبیہوں کا پتہ چلتا ہے ۸۰۰ ق۔م۔ یونانی تحریروں کا صحیح معنوں میں کوئی پتہ نہیں چلتا۔ البتہ ٹرائے (Troy) اور کریٹ وغیرہ میں کھدائی کے بعد جو چیزیں دستیاب ہوئی ہیں۔ ان سے قدیم یونانی لوگوں کے متعلق بہت سی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ مختلف جگہوں پر کھدائی کے بعد مضبوط اور خوبصورت عمارتیں نکلی ہیں۔ شاہی قلعوں کو بھی زمین سے باہر نکالا گیا ہے۔ قدیم یونان کی ایک تاریخ ہمارے سامنے آگئی ہے قلعوں میں آرام و آسایش کی ساری چیزیں موجود ہیں۔ مٹی کی بہت ساری تختیوں پر قدیم یونانی زبان کی تحریریں بھی نکلی ہیں۔ لیکن انہیں اب تک پڑھا نہیں جا سکا ہے۔ شاہی قبروں سے سونے، چاندی اور ہاتھی دانت کے زیورات بھی نکلے ہیں کریٹ۔ ایگیس اور گریس میں جو چیزیں باہر آئی ہیں وہ بتا رہی ہیں کہ وہاں بھی انسان کی کوئی قدیم تہذیب تھی۔ جو کافی آگے بڑھ چکی تھی۔ مٹی کی تختیوں کی تحریروں کو اگر پڑھ لیا جاتا تو ہمارے سامنے قدیم تہذیب کے نہ جانے کتنے نقوش سامنے آجاتے۔ اور ہم زندگی کے بہت سارے اسرار و رموز سے آگاہ ہو جاتے۔ ماہرین

اس بات پر متفق ہیں کہ دو ہزار سال تک یونانی تہذیب نے زندگی کو روشن کیا اور پھر انگنت صدیوں تک یونان میں تاریکی ہی تاریکی رہی۔ قدیم یونان پر ایشیا کی قدیم تہذیب کے بھی گہرے اثرات ملتے ہیں۔ یونان میں ایشیا کے لوگوں کی آمد و رفت شروع سے رہی۔ ایشیا کے لوگوں نے وہاں نئے نئے شہر بسائے۔ اور نئی چیزوں کی تخلیق کی۔ چھٹی صدی میں یونان میں بہت ساری حکومتیں تھیں۔ پہاڑوں اور مذہبوں کی وجہ سے ایک صوبہ دوسرے صوبہ کے قریب نہیں رہ سکا۔ اور نہ زیادہ تعلقات ہی قائم تھے۔ ایک شہر ہی ایک حکومت کی شکل میں سامنے تھا۔ اس لئے کہ شہر میں بازار بھی تھے۔ حاکم بھی تھے۔ فوجیں بھی تھیں۔ ہر شہر میں ایک دنیا آباد تھی۔ بعض مورخین اسی وجہ سے یونانی حکومتوں کو "شہری حکومتیں" کہتے ہیں۔ اسپارٹا، ایتھنز اور کورنتھ وغیرہ اس وقت کے بہت ہی مشہور شہر تھے۔ اور وہاں کی حکومتیں کافی مضبوط تھیں۔ قدیم یونان میں "تمام یونانی ایک ہیں" یا اس قسم کا کوئی نظریہ نہیں ملتا۔ اجتماعی زندگی میں ہم آہنگی کا گہرا احساس لوگوں کو نہیں تھا۔ قدیم یونانی یہ سمجھتے تھے کہ یونان میں بہت ساری قومیں آباد ہیں۔ اور سبھوں کا تعلق ایک دوسرے سے بالکل نہیں ہے۔ لیکن اسکے باوجود ان کی زبان ایک تھی۔ انکے رسوم، ان کے مذہبی عقیدے اور ان کی جد و جہد کے طریقے ایک تھے۔ اس وقت بھی یونان میں مختلف بولیاں تھیں۔ یونانیوں نے اپنی زبان کے لئے حروف خود نہیں تراشے تھے۔ بلکہ دوسری زبانوں سے حروف لئے تھے۔ اور انہیں اپنے مزاج اور ماحول کے مطابق ڈھالا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ فونیشنس (Phoenicians) تاجروں کے حرفوں سے متاثر ہو کر قدیم یونانیوں نے اپنے حروف تیار کئے تھے۔ یونانیوں نے اپنے دو پہلے حرفوں الفا (Alpha) اور بٹا (Beta) فونیشنس (Phoenicians)

کے پہلے دو حرفوں کی آواز کے سہارے رکھا۔ فونیشس اپنے دو پہلے حرفوں کو الیف (Alpha) اور بتھ (Beth) کہتے تھے۔ (فونیشس (Phoenicians) مسوپٹامیا اور مصر میں اپنے خاص رسم الخط کو رائج نہیں کر سکے لیکن میڈیٹرین کے عوام میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ اس لئے کہ یہاں کے عوام لکھنا پڑھنا قطعی نہیں جانتے تھے۔ ایشیائی حروف نے حیات کو اپنے اندر جس قدر سمیٹ لیا ہے۔ اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے۔ کہ آج دنیا کی نصف آبادی ایشیائی حروف استعمال کرتی ہے۔ چونکہ فونیشس (Phoenicians) اپنی خاص زبان کو اپنے قریب رہنے والوں کو اچھی طرح نہیں سمجھا سکے تھے اسلئے ان کی زبان عوام کی نہیں بن سکتی تھی۔ یہ لوگ تاجر تھے۔ اسلئے افریقہ اور یورپ کے مختلف مقاموں کا سفر کرتے تھے۔ تجارتی کاغذات بنانے میں جلدی کرتے تھے۔ اسلئے کہ انہیں صرف ایک جگہ رہنا نہیں پڑتا تھا۔ اور اسی جلدی کی وجہ سے خوب صورت اور نکھرے ہوئے انداز اور تصویروں کو بھدہ اور بدشکل بنا دیا۔ اور ہزاروں ایسی تصویریں ختم ہو گئیں جو ہمیشہ سے رائج تھیں۔ اور صرف بیس یا چوبیس حروف ساتھ لیکر یورپ اور افریقہ کے علاقوں میں تجارت کے لئے سفر کرتے رہے) قدیم یونانی لوگوں نے فونیشس کے بہت سارے اثرات قبول کئے ان کی طرح دائیں سے بائیں لکھا اور بہت سارے لفظوں کو اپنا لیا۔ لیکن رفتہ رفتہ ان کی تحریروں میں بہت ساری تبدیلیاں آگئیں۔ قدیم یونانی ادب میں کچھ حقیقتیں اور کچھ خیالی باتیں ہیں عوام کی زندگی کی جھلکیاں ہیں۔ اور ساتھ ساتھ دیوتاؤں اور بادشاہوں کی شجاعت اور بہادری کے افسانے ہیں۔ مافوق الفطرت سپر نیچرل (Supernatural) عناصر قدیم یونانی ادب میں اچھی طرح شامل ہیں۔ ہومر کی ایلیڈ اور اوڈیسی (Iliad & Odyssey) میں اس قسم کی کہانیاں ملتی ہیں

ایلیڈ (Ilaid) میں یونانیوں اور ٹروجنز (Trojans) کی
دس سالہ جنگ کی کہانی ہے۔ اور اوڈیسی میں اولیسس (Ulysses)
کی جدوجہد کی کہانی ہے جب وہ دس سالہ جنگ سے واپس آتا ہے۔ یونانیوں
نے ٹرائے کے خوبصورت شہر کو برباد کر دیا۔ اور پھر اس پر قبضہ کر لیا۔ یونانیوں
کا یہ ایک کارنامہ تھا جس پر وہ ہمیشہ فخر کرتے ہیں۔ یونانیوں نے اپنی اس جدو
جہد کی مکمل کہانی لکھ لی تھی۔ تاکہ ان کے ذہن میں ان تحریروں سے واقعات
تازہ رہیں۔ شہر شہر اور گاؤں گاؤں گھومنے والے فقیروں اور جوگیوں نے
اس کہانی کو عام کیا۔ حالات بدلتے گئے۔ ماحول کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ
اس کہانی میں بھی بہت ساری تبدیلیاں آئیں۔ یہ کہانی کافی بڑی ہو گئی۔ اور
مختلف صدیوں کے گہرے اثرات سے مختلف نقش و نگار بنتے گئے۔ اب اس کی
صورت ایک حیرت انگیز رزمیہ (Epic) کی ہے۔ اب یہ کہنا دشوار ہے کہ
اس رزمیہ کا کون سا حصہ حقیقی ہے۔ اور کہاں باتیں بنائی گئی ہیں۔ قدیم یونان
میں تاریخ اور کہانی کے فرق کا بھی احساس لوگوں کو ہو گیا تھا۔ چوتھی اور تیسری
صدی میں یونانیوں کو اس کا علم تھا۔ کہ تاریخ اور تواریخی حقیقتیں کہانیوں
اور چٹکلوں سے الگ ہیں۔ یونانیوں کے لئے جو کہانیاں لکھی ہیں وہ ڈراموں
کی صورت میں ہیں۔ ڈراموں میں زندگی سے گریز کا جذبہ بھی ہے اور زندگی
سے پیار بھی ہے۔ غم اور آنسو بھی ہیں۔ خوشی اور مسکراہٹ بھی ہے۔ المیہ
اور طربیہ دونوں قسم کے ڈرامے لکھے گئے ہیں۔ قدیم یونانی ڈرامہ نگاروں میں
سوفوکلس (Sophocles) یوری پائیڈس (Euripides) اور ارسٹو
فینس (Aristophanes) اور اسکائی لس (Aeschyles) کے نام
اہم ہیں۔ یونانی ڈرامہ نگاروں نے انسان کی زندگی کی کشمکش کو پیش کیا۔ انسان

اور تقدیر کی کشمکش اور انسان اور دیوتاؤں کی کشمکش کو نمایاں کیا۔ انسان اور اسکے برے کردار کی کشمکش اور انسان اور سماجی نظام کی کشمکش کو پیش کیا۔ دراصل یہی کشمکش ڈراموں کی جان اور زندگی ہوتی ہے۔ کشمکش کے بغیر ڈراموں کے متعلق کچھ بھی سوچا نہیں جا سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسکائی لس (Aeschylus) نے قدیم یونانی ڈراموں کی بنیاد رکھی تھی۔ اسکائی لس (۵۲۴ - ۴۵۶ ق-م) نے ایسے بھی کردار پیش کئے ہیں جن میں کوئی زندگی نہیں ہے۔ ان کا یونانی ماحول سے کوئی خاص تعلق نظر نہیں آتا۔ اس نے کچھ ڈراموں میں ایسے بھی مکالمے پیش کئے ہیں جن میں مکالموں کی خصوصیتیں نہیں ہیں۔ یونانی مذہبی عناصر ہر جگہ نمایاں ہیں۔ مافوق الفطرت عناصر (Supernatural Elements) کے ساتھ اساطیری عناصر (Mythological Elements) ہر جگہ موجود ہیں۔ دیوتاؤں کے کردار میں فضا حقیقی نہیں ہے۔ دیوتاؤں کا غصہ، ان کا حسد، ان کی طاقت، ان کی بزدلی سب کچھ مل جاتی ہے۔ مکالمے منظوم ملتے ہیں جو بہت حد تک اکتا دینے والے ہیں۔ اس کے ڈراموں میں انسان اپنی تقدیر کا محتاج نظر آتا ہے۔ اس طرح اسکی جدو جہد میں کوئی خاص بات پیدا نہیں ہوتی۔ صوفوکلس (۴۹۵ - ۴۰۶ ق-م) کے ڈراموں میں ماحول کے حالات اچھی طرح نمایاں ہیں۔ اس کے وقت میں یونانیوں کے درمیان دیوتاؤں کے سلسلہ میں اس طرح سوچا نہیں جاتا تھا۔ جس طرح ۴۵۶ برس قبل مسیح سوچا جاتا تھا۔ یونانیوں نے دیوتاؤں کو اپنی زندگی سے کچھ دور کر دیا تھا۔ صوفوکلس کے دیوتاؤں میں ماحول کا یہ رنگ گہرا ہے۔ اس کے ڈراموں میں ایک اور بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے پہلی بار اپنے کردار صرف عورت اور مرد رکھے اور بار بار دیوتاؤں کا آنا اور انسانی زندگی میں دخل دینا صوفوکلس کے یہاں

نہیں ہے۔ اس کے ڈراموں میں اس کا اندازہ پہلی نظر میں ہو جاتا ہے کہ یونان کا ماحول بدل چکا تھا۔ اس نے انسان کی کمزوریوں کو اچھی طرح بتایا ہے اس کے یہاں یونان اور دیوتاؤں کی کشمکش نہیں ہے۔ بلکہ انسانوں کی کشمکش ہے۔ ان کی کشمکش سے جو حالات پیدا ہوتے ہیں۔ ان پر اسکی نظر گہری ہے یوری پائڈس (۴۸۴ - ۴۰۶ ق م) کے ڈراموں میں قدیم یونانی زندگی کی مکمل تصویر کشی ہے۔ حقیقت نگاری ہر جگہ ہے۔ اس نے دلچسپی پیدا کرنے کے لئے سماجی زندگی سے بعض بہت ہی دلچسپ حقیقتوں کا انتخاب کیا ہے۔ اسکے کردار میں رومان اور سنسنی خیزی ہے یوری پائیڈس کے ڈراموں میں پہلی بار یونان کی سیاست نمایاں ہوتی ہے۔ اخلاقی اور مذہبی عناصر بھی جا بجا ملتے ہیں ارسٹوفینس (۴۴۸ - ۳۸۸ ق م) نے طنز و مزاح کو ڈراموں میں جگہ دی اور گرتی ہوئی حالت پر چوٹیں کیں۔ خیالات اور سماج کی گندگیوں کو نمایاں کیا۔ اس نے کامیڈی ڈرامے زیادہ لکھے ہیں۔ اس نے پڑھے لکھے لوگوں کی پس ذہنیت پر طنز کیا۔ قانون اور زندگی کے دوسرے عناصر پر گہری چوٹیں ماریں، ہیرو ڈوٹس (Herodotes) (۴۸۴ - ۴۲۵ ق م) کی تاریخ سے بھی قدیم یونان کی زندگی کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ اس نے یونان کے وحشی انسانوں کی جو تاریخ پیش کی ہے۔ وہ بہت ہی دلچسپ ہے۔ ہیرو ڈوٹس نے تمام یونان کا سفر کیا تھا۔ اور سینکڑوں کہانیاں، واقعات اور لطیفے جمع کئے تھے۔ یونان کی جنگوں کی کہانیاں نہایت ہی دلچسپ ہیں۔ قدیم یونان میں سائنس اور فلسفہ میں بھی کافی ترقی ہوئی۔ تھیلس (Thales) نے چھٹی صدی قبل مسیح سائنس کو ترقی دی۔ اس نے ۵۸۵ سال قبل مسیح سورج گرہن کی وجہ بتائی تھی۔ ستاروں کی رفتار کا اسے کافی علم تھا۔ فیثا غورث نے یونان

میں پہلی بار چھٹی صدی میں بتایا کہ دنیا گول ہے۔ ڈیموکریٹس بھی قدیم یونان کا ایک بڑا سائنس دان اور مفکر تھا۔ ہپوکریٹس نے علاج کے لئے نئے طریقے بتائے اور نئی نئی دوائیں تیار کیں۔ یونانی تہذیب میں یہ لوگ جو نقش و نگار بنا رہے تھے۔ انہیں کون فراموش کر سکتا ہے۔ سقراط نے قدیم یونان میں اپنے خیالات سے جو کھلبلی مچادی ہے۔ اسے کون بھولے گا۔ اس نے پڑھنے اور پڑھانے کے خاص طریقے بتائے۔ اسکے یہاں سوال اور جواب کے علیحدہ انداز ہیں۔ اس کے مکالموں میں زندگی کے فلسفے ہیں۔ انسان کی، انفرادیت میں حسن پیدا کرنے کی وہ تلقین کرتا ہے پیلو پونیسین جنگ اس وقت کی جمہوری حکومت نے سقراط کو انسان کا دشمن قرار دیا۔ یہ کہا گیا کہ وہ مذہب کا دشمن ہے اور نئی نسل کی زندگی تباہ کر رہا ہے۔ نتیجے کے طور پر اسے زہر کا پیالہ پیش کیا گیا۔ اور وہ ہمیشہ کی نیند سو گیا۔ افلاطون نے جو اس کا شاگرد تھا۔ اسکے خیالات کو تمام پھیلایا۔ آج کسی بھی فلسفہ کا تجزیہ سقراط کے فلسفہ کی مدد کے بغیر نہیں کیا جا سکتا ہے۔ افلاطون نے بہت کچھ لکھا ہے۔ اسکی تحریروں میں اس کی تخلیقی قوتیں بھی نظر آتی ہیں۔ افلاطون نے ایک فلسفی کی نگاہ سے قدیم یونان کو دیکھا تھا اور زندگی کے مسائل لوگوں کو سمجھائے تھے۔ وہ ہر جگہ سقراط کے خیالات کا سہارا لیتا تھا۔ مکالموں میں سقراط کے خیالوں سے ہمیں ہر جگہ واسطہ پڑتا ہے۔ ارسطو (۳۸۴ - ۳۲۳ ق-م) نے بھی اپنے فلسفیانہ خیالات سے یونانیوں کو چونکا دیا ہے۔ وہ ۳۴۳ء میں میکدونیا گیا اور وہاں سکندر کا استاد بنا۔ جب سکندر دنیا کو فتح کرنے کے خیال سے باہر نکلا تو ارسطو ایتھنز لوٹ آیا۔ اور وہاں اس نے اپنا

ایک اسکول قائم کیا۔ ارسطو نے افلاطون سے تعلیم حاصل کی۔ لیکن دونوں کے خیالات میں بہت فرق ہے۔ ارسطو نے افلاطون کے بہت سارے خیالات کو غلط ثابت کیا۔ ارسطو کا انتقال ۳۲۲ء میں ہوا اور اسکے ساتھ ساتھ قدیم یونان کی یہ تہذیب بھی ختم ہوگئی۔ یونان کے وہ شہر جو اسٹیٹ یا ریاست کہلاتے تھے۔ جمہوری زندگی سے محروم ہوگئے۔ فلپ اور پھر سکندر نے بہت سارے شہر قبضہ میں لے لئے۔ سکندر ایک طرف یونان کی آزاد سیاسی زندگی کو تباہ کر رہا تھا۔ اور دوسری طرف یونانی زبان، ادب، سائنس، اور فلسفہ کو لیکر آگے بڑھتی جارہی تھی۔ رومن تہذیب پر بھی یونانی تہذیب کا گہرا اثر ہوا اور پھر ایک نئی تہذیب بنتی گئی۔ جسے ہم "یونانی رومن تہذیب" کہہ سکتے ہیں۔ اسی تہذیب کی بناء پر آج یورپ کی دوسری تہذیبیں قائم ہیں امریکہ کی تہذیب کی بھی بنیاد یہی ہے۔

قدیم یونان میں تین قسم کی بولیاں تھیں۔ ڈورک۔ ایولک اور آئونک۔ موجودہ ماہرین لسانیات یونانی بولیوں کی تقسیم دو حصوں میں کرتے ہیں۔ آئونک اور غیر آئونک ۔ چھٹی صدی قبل مسیح کے آخیر میں آئیونک خاندان کی ایک بولی کافی آگے بڑھ چکی تھی۔ اور اسکا مقابلہ کسی دوسری زبان سے نہیں تھا۔ سیاسی اور سماجی ماحول نے اس بولی کو نکھرے اور نکھرے الفاظ دے کر بہت آگے بڑھایا۔ یونان جب میکڈونیا کے ماتحت ہوا۔ تو آئونک عام زبان ہوگئی اور میسو ڈونیا کورٹ کی زبان بھی یہی قرار پائی۔ سکندر کی جب مصر میں کچھ کامیابی ہوئی تو الگزنڈریا زبان و ادب کا خاص مرکز بن

گیا۔ اور ہیلنک بولی سرکاری بولی بن گئی۔ ہیلنک کے متعلق شروع میں محدود طریقوں سے سوچا گیا۔ باہر سے آئے ہوئے لوگ جو یونانی زبان بولتے تھے اسے ہیلنک کہتے تھے۔ یہودیوں کی زبان کو خاص طور پر ہیلنک کہتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ لفظ وسیع ہوتا گیا۔ اور اس سے وہ زبان مراد لی جانے لگی جو سکندر کے وقت میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ بعد میں لیٹن الفاظ یونانی زبان میں کافی شامل ہو گئے۔ رومن اور یونانی قوموں کے ملاپ کا یہ اثر تھا۔ رومیوں نے مغرب پر جس طرح اپنے اثرات چھوڑے ہیں۔ اسپین، گول اور برطانیہ کے تمدن پر ان کے نقوش ہیں۔ اپنی زبان سے جس طرح ان ممالک کو متاثر کیا ہے اس طرح ان کا اثر مشرق پر نہیں ہے۔ رومن یا لیٹن زبان مشرق میں عام زبان نہیں بن سکی۔ جس طرح مغرب میں بن گئی۔ فرانس، پرتگال اور اسپین کی زبانوں کا جس طرح لاطینی زبان سے تعلق ہے۔ اس طرح مشرق کی زبانوں کا اس سے تعلق ہی نہیں ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے۔ کہ یونان، سیریا اور مصر کی تہذیبیں بہت آگے جا چکی تھیں۔ رومیوں کی تہذیب سے بھی آگے۔ ان پر رومن تہذیب کا گہرا اثر ہونا ناممکن تھا۔ یہ ضرور ہوا کہ یونان کے لوگوں نے رومن تہذیب سے بہت سارے طریقے سیکھے۔ پڑھے لکھے لوگوں کو لاطینی زبان سیکھنا پڑی۔ اس لئے کہ حکومت کا کوئی کام اس زبان کی مدد کے بغیر ممکن نہ تھا۔ عوام نے اپنی زبان نہیں چھوڑی۔ تعلیم، ادب، فلسفہ، سائنس سب کی زبان یونانی تھی۔ رومیوں کی کامیابی کے بعد یونان کے کلچر میں کوئی زیادہ تبدیلی نہیں آئی۔ یونانی زبان میں لاطینی زبان کے بہت سارے الفاظ شامل ہو گئے

لیکن یونانی زبان کی انفرادیت قائم رہی رومیوں نے البتہ یونان کی تہذیب و تمدن سے بہت کچھ سیکھا۔ ہزاروں پڑھے لکھے یونانیوں کو گرفتار کر کے اٹلی لایا گیا۔ جہاں ان کا کام یہ تھا کہ وہ دولت مند لوگوں کے بچوں کو یونانی پڑھاتے تھے۔ اور وہاں کے کلچر کے خوبصورت پہلوؤں کو سمجھاتے تھے۔ رومیوں کو یونان کی ترقی یافتہ تہذیب کو دیکھ کر تعجب ہوا۔ وہ یہ سمجھ گئے کہ یونانی ہر لحاظ سے ان سے بلند ہیں لہذا رومیوں نے یونانی کلچر کو سمجھنا شروع کیا۔ ان کی کتابوں اور آرٹ کا تجزیہ کیا گیا۔ روم سے یونان لوگ تعلیم حاصل کرنے کے لئے آنے لگے روم کی عمارتوں پر یونانی فن کا گہرا اثر۔ انہوں نے یونانی کتابوں کے ترجمے کئے۔ ان کی بنیاد پر بہت ساری کتابیں لکھی گئیں۔ رومن ادیبوں کو یونانی کتابوں سے بہت مواد حاصل ہوئے۔ ان کے ڈراموں نے تو یونانی ڈراموں کے کافی اثرات قبول کئے ہیں

یونان کی تاریخ پر گہری نظر رکھی جائے تو معلوم ہوگا کہ یونانی زندگی میں بہت ساری تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ شروع میں یونان میں میسوپوٹیمیا کی طرح چھوٹی چھوٹی شہری حکومتیں تھیں۔ یہ حکومتیں آس پاس کی زمین کی پیداوار پر قائم تھیں۔ ان حکومتوں کے بادشاہ نہیں تھے۔ بلکہ شہر کے بڑے رئیس اور دولت مند حکومتیں چلاتے تھے۔ مختلف شہری ریاستیں علیحدہ رہ کر سماجی اور سیاسی اور معاشی زندگی کے تجربے کر رہی تھیں۔ ہر ریاست آزاد تھی۔ ہر ریاست میں غلام تھے جو حکومت کے کاموں میں دخل اندازی نہیں کرتے تھے

نیم شاہی اور نیم پنچایتی سماج میں اس وقت کے یونانی

زندہ تھے۔ عورتوں کو بھی ان کے حقوق حاصل نہیں تھے۔ وہ بھی حکومت کے کاموں میں حصہ نہیں لے سکتی تھیں۔ ایک ہی طبقہ تھا جو حاکموں کا انتخاب کرتا تھا۔ یونانی بہت دور دور تک پھیلے لیکن انہوں نے اس کی کوشش کبھی نہیں کی کہ ان کا کوئی نظام قائم ہو۔ کوئی مستقل بڑی حکومت قائم ہو۔ وہ چھوٹی چھوٹی شہری حکومتوں کے قائل رہے۔ آپس میں لڑتے رہے اور اپنی آزادی کی آواز بلند کرتے رہے ان ساری باتوں کے علاوہ ان کی زبان، ان کا کلچر اور ان کا مذہب ایک تھا۔ ان کے دیوتا ایک تھے۔ ان کے کھیل کود کا سامان ایک تھا۔ ان کے سوچنے کا ڈھنگ ایک تھا۔ یہ لوگ زیتون اور انگور کی کاشت کرتے تھے۔ شراب اور تیل کی تجارت عام تھی۔ ماہی گیری ان کا شغلہ تھا۔ ارسیس (جنگ کا دیوتا) زیبس، ہرمیس، اپولو اور اسی قسم کے نہ جانے کتنے دیوتا تھے۔ جن پر سارے یونانیوں کا اعتقاد تھا۔ لوگوں کی تعلیم کی ذمہ داری حکومت پر تھی۔ لیکن ان لڑکوں کے مرنے کے لئے ان کے حال پر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ جو کمزور ہوتے تھے۔ قدیم مصری، کری، بابلی اور سد نقل نسل کے لوگوں کی طرح قدیم یونانی بھی اپنے مردوں کا احترام کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ روح آتی ہے اور قبروں میں بھی انسان زندہ رہتا ہے۔ آفتاب، ماہتاب، تارے، بجلیاں، سمندر، پہاڑ، پانی، آگ، درخت اور حیوان کی روحوں پر ان کا اعتقاد تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے سبھوں کے لئے ایک دیوتا تیار کر لیا تھا۔ قدیم یونانی اوہام پرست تھے اور بہت ساری عجیب باتوں پر ایمان رکھتے تھے پانچ سو سال قبل مسیح تک یونانیوں کی یہی حالت رہی۔ اسکے بعد یونان کی فضا بدلی

وہاں ایسے مفکر پیدا ہوئے جنہوں نے نئی راہیں دکھائیں۔ اینکیگورس نے دیوتاؤں کی پرستش کی مخالفت کی۔ اس نے بتایا کہ صرف ایک ہی عظیم ہستی ہے جس کی پرستش ہونی چاہیئے۔ اس کے بعد زندگی، کائنات، موت اور ساری چیزوں کے متعلق غور کرنے پر لوگ مجبور ہوئے۔ بڑی بڑی بحثیں ہوئیں۔ پبلی کارنسس نے بھی ماحول کی گندگیوں کی طرف اشارہ کیا۔ اوہام پرستی اور دیوتاؤں کو کپڑے پہنانے اور اس وقت کی دوسری باتوں کی سخت مخالفت کی۔ سقراط، افلاطون اور ارسطو نے نئے خیالات اور نئی باتوں سے لوگوں کو چونکا دیا۔ اور نئی نسلوں میں ایک زندگی پیدا کردی۔ کیسینیون اور ایسقراط کے کارناموں کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ان مفکروں نے زندگی کے ہر شعبہ کی تاریکیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ مسائل حیات کو سلجھایا۔ سیاسی زندگی کے لئے بھی کچھ اصول بنائے۔ فکری اور روحانی زندگی کے ساتھ ساتھ مادی زندگی کے متعلق اپنے اعلیٰ خیالات پیش کئے۔ یونان کی دنیا بدل سی گئی سوچنے اور عمل کرنے کا ڈھنگ بدل گیا۔ قدیم یونانیوں کی باتیں دلچسپ حکایتوں کی صورت اختیار کرچکی تھی۔ زندگی میں ایک قسم کا انقلاب آگیا تھا۔ ادب اور آرٹ میں بھی زبردست تبدیلیاں نمایاں ہوئیں۔ مصوری، نقاشی اور سنگ تراشی میں زندگی سی آگئی۔ انسانوں اور دیوتاؤں کے نہایت ہی خوب صورت مجسمے بنائے گئے۔ مٹی کے برتنوں پر یونانی نقاشی دیکھکر انسان حیران رہ جاتا ہے۔ آرٹ میں حقیقت کو شامل کیا گیا۔ اب وہ اژدھے نہیں بنائے جاتے تھے۔ جن کی ٹانگیں شیر کی طرح اور عقاب کی طرح ہوتی تھیں انسانی جدوجہد کی تصویریں بنائی گئیں۔ اس طرح یونانی زندگی کہاں سے

کہاں تک آ گئی۔! ہندوستان کے کلچر کا بھی یونان پر گہرا اثر پڑا ہے۔ افلاطون اور ایلیٹکس (Eleatics) کے خیالات پر ویدانت فلسفہ کا جو صاف اثر ملتا ہے اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔ فیثا غورث نے ہندوستانی خیالات کی بناء پر اپنے خیالات کی عمارت تعمیر کی تھی۔ اب بہت سارے ماہرین اسے قبول کرتے ہیں۔ قدیم ہندوستانی فلسفوں نے یونانی مفکروں کے خیالات پر گہرا اثر چھوڑا ہے۔ ایپی کیورس، ڈیموکریٹس ہیراکلیٹس، اناغورث اور دوسرے مفکرین کے خیالات پر ہندوستانی فلسفوں کے نقوش ہیں۔ وہ خیالات جو قدیم ہندوستان میں بہت پہلے تھے یونان میں بعد میں آئے۔ فارس اور ایشیائے کوچک سے بھی یونانی ہندوستان کے یہ اثرات حاصل کر رہے تھے۔ بدھ ازم نے جو کہانیاں دیں بدھ ازم کے پھیلنے کے بعد ہندوستان کے کلچر پر جو اثر ہوا اسکی بھی حالت یونان میں موجود ہے۔ پالی اور سنسکرت نے ہندوستان کی بہت ساری روایتوں کو دور تک پھیلا دیا۔ ہندوستان کے مذہب اور دیوتاؤں نے بھی یونانی مذہب اور دیوتاؤں کو متاثر کیا ہے۔ قدیم ہندوستان کی بہت ساری دلچسپ حکایتیں یونان گئیں اور وہاں کے عوام کو متاثر کئے بغیر نہ رہ سکیں۔ ہندوستانی ادب میں ہمارے کلچر کی تاریخ ہے ہماری دولت اور جمالیاتی قدروں کے متعلق کسی کو اس وقت تک علم نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ تین ہزار سال میں پھیلی ہوئی ہندوستانی ادب کی تاریخ پر گہری نظر نہ رکھے۔ اس کے بغیر عظیم ہندوستانی ادب کے ساتھ انصاف بھی نہیں ہو سکتا۔ انڈو ایران زبانوں کا ایرانی زبان سے گہرا تعلق ہے دونوں ملکر ایک بڑے خاندان کی زبان کی شاخ بنجاتی

ہیں۔ اس خاندان کو انڈو یوروپین خاندان کہا جاتا ہے۔ یورپ کی بہت ساری زبانیں اسی خاندان کی ہیں۔ اس خاندان کے گہرے مطالعہ کے بعد عوام کے قدیم تعلقات پر بہت اچھی روشنی پڑتی ہے۔ یہ بات تو ثابت ہو جاتی ہے کہ ان زبانوں کا اتحاد تھا۔ اور اس اتحاد نے مختلف زبان بولنے لوگوں کا تعلق گہرا کیا ہے۔ ان ماہرین لسانیات کا کہنا غلط ہے جو انڈو یوروپین (Indo European) زبانوں کے بولنے والوں میں بنیادی فرق محسوس نہیں کرتے۔ ان لوگوں کی رشتہ داری قدیم ہے۔ اور ایک ہی بنیاد سے یہ ساری عمارتیں اٹھی ہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ ان لوگوں کے درمیان ایک خاص زبان تھی جس سے ذہنی اور ثقافتی تعلقات ہموار ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی ماہرین لسانیات اور خصوصاً کتھ اور ونٹر نٹز یہ سوچتے ہیں کہ ہندوستانی چمڑوں اور ہڈیوں کا تعلق ان کے چمڑوں اور ہڈیوں سے نہیں ہے۔ البتہ انہیں ہندوستانی ادب میں مغربی دماغ کی تلاش کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کے قدیم ادب میں مغربی دماغ ہر جگہ کام کر رہے ہیں یہ قطعی دوسری بات ہے کہ ہندوستانیوں کی ہڈیوں اور چمڑوں کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ قدیم یونانی، روسی، جرمنی، مصری اور فارسی ادب پر ہندوستانی خیالات اور تصورات دیکھے جا سکتے ہیں۔ یونان اور ہندوستان کی قدیم حکایتوں اور داستانوں میں جو یکسانیت اور مماثلت ہے دونوں کی جو متوازی صورتیں ہیں اور دونوں جس طرح پہلو بہ پہلو چلتی ہیں ان کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں کافی بحثیں ہو رہی ہیں اور بہت سارے دلچسپ خیالات سامنے آ رہے ہیں۔ وگنیر کا خیال

ہے کہ یونان نے ہندوستان سے یہ حکایتیں اور داستانیں حاصل کی ہیں لیکن بنفی (Benfey) اور اس قسم کے دوسرے ماہرین یہ کہتے ہیں کہ ہندوستان نے ایران کی داستانوں اور حکایتوں کو اپنے رنگ میں پیش کیا ہے۔ کیلر (Keller) نے ان باتوں کا تجزیہ خوب کیا ہے اور جہاں اور بہت ساری باتیں کہی ہیں وہاں یہ بھی کہا ہے کہ داستانوں اور حکایتوں میں ہمیں جانوروں کی فطرت کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ اسطرح ظاہر ہوسکے گا کہ کس ملک کا جانور کیسی حرکت کرتا ہے۔ اور داستان اور حکایت لکھنے والے اپنے ماحول اور سماجی حالات کے مطابق ان جانوروں کی فطرت سے ضرور کام لیتے ہونگے۔ کسی داستان یا حکایت میں اگر ایک گیدڑ شکار کرتا ہے اور شیر کو اپنے شکار کھانے کی دعوت دیتا ہے تو ہندوستانی روایت کے مطابق یہ بات بہت حد تک درست ہے۔ اس لئے ہندوستان میں شیر کو بادشاہ سمجھا گیا ہے اور ایک ہندوستانی بادشاہ کے لئے ایک ایسے عقلمند وزیر کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس میں چالاکی اور دوسری بہت ساری خوبیاں ہوں۔ اور چالاک گیدڑ ایک وزیر کی حیثیت سے پیش ہوا ہے۔ جس حکایت میں گیدڑ کی جگہ لومڑی ہے ظاہر ہے کہ وہ حکایت یونان کی ہے۔ یونان میں وزیروں کی وہ اہمیت نہیں تھی۔ جو ہندوستان میں تھی۔ ہندوستانی وزیر اپنی عقلمندی کا معجزہ دکھاتے رہے ہیں۔ لومڑی گیدڑ سے کم چالاک ہے۔ ظاہر ہے ہندوستانی حکایتوں میں گیدڑ کی موجودگی میں لومڑی کو وزیر نہیں بنایا جاسکتا ہے۔ کیلر نے اس قسم کی بہت سی مثالیں دی ہیں۔ کچھ ماہرین یہ کہتے ہیں کہ ان حکایتوں اور داستانوں کی تخلیق نہ ہندوستان میں ہوئی

ہے اور نہ یونان میں۔ بلکہ دونوں کے درمیان کی جگہوں پر یہ حکایتیں
دراصل لکھی گئی تھیں۔ دونوں ملکوں نے ان کا اثر لیا ہے۔ مصر نے بھی بہت
ساری حکایتیں اور داستانیں دی ہیں اور یونان اور ہندوستان کے لوگ
ان سے متاثر ہوئے۔ ہرٹل (Hertel) کا خیال ہے کہ جن حکایتوں
کہانیوں اور داستانوں میں سیاسی رنگ ہے اور جن کے کردار سیاسی
حالات پر تبصرہ کرتے ہیں وہ حکایتیں اور کہانیاں ہندوستان کی ہیں۔ اسی
طرح کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ جن حکایتوں میں مزاح کا رنگ گہرا ہے
اور طنزیہ انداز ہے وہ یونانی حکایتیں ہیں۔ اسلئے کہ ہندوستان میں
بدھ ازم کی وجہ سے مزاح اور طنز کے اشارے ختم ہو گئے تھے۔ یہ دونوں
باتیں کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہیں۔ اندرا، ہیراکلس اور تھور کی کہانیوں
میں جو اساطیری انداز ہیں۔ ان میں قدیم تہذیب کی یکسانیت کی جھلک ہر جگہ
موجود ہے۔ یہ بات بھی ممکن ہے کہ کوئی حکایت یونان میں بنائی گئی ہو۔ وہ
ہندوستان آئی اور پھر یونان چلی گئی ہو۔ ایک قدیم یونانی گلدان پر
لومڑی اور پہاڑی کوا یا زاغ کی تصویری کہانی پائی گئی ہے۔ جو غالباً چھٹی
صدی قبل مسیح کی تاریخ کا پتہ دیتی ہے۔ ہندوستان میں لومڑی اور کوا
کی کہانی بعد میں آئی ہے۔ اس کے برعکس ہندوستان میں راج ہنس اور
کچھوے کی وہ کہانی جس میں راج ہنس کچھوے کو اوپر سے گرا دیتا ہے
بہت قدیم ہے۔ یونان میں ڈیموکریٹس کے یہاں یہ کہانی بعد میں آئی ہے
پنچ تنتر کی بہت ساری حکایتیں یونان میں بعد میں پہنچی ہیں۔ اور
ہندوستان میں ان کی تخلیق پہلے ہوئی ہے۔ شیر اور گیدڑ کی زیادہ
کہانیاں عقلمند جانور اور بے وقوف انسانوں کی حکایتیں، چوہوں کی

بادشاہت اور ان کی حکومت کا رنگ و روپ۔ جادو کے اثرات اور پریوں کے افسانوں پر احسانات۔ یہ ساری باتیں ہندوستان سے یونان گئی ہیں۔ اور وہاں بھی اپنی اصلی حالت اور ہندوستانی رنگ کو نہیں چھپا سکی ہیں۔ ہندوستانی دواؤں اور ہندوستانی حساب نے بھی یونان کو متاثر کیا ہے۔ یونان نے ہندوستانی دواؤں سے بہت فائدہ حاصل کیا ہے اور ہندوستانی حساب سے انہوں نے اپنی بہت ساری بنیادیں درست کی ہیں برہم گپتا، بھاسکر اور مہاویر کے خیالات کے گہرے نقوش یونان پر ہیں — دمسکیوس (Damaskios) اور سمپلی کیوس (Simplikios) بھی ہندوستان کے حساب (Mathematics) سے متاثر ہوئے ہیں۔ منھرا کے بدھ اور پراکزی ٹلس کے ہرمس (HERMES OF PRXITELS) کی مناسبت اور پاروتی اور وینس آف میلو کی مناسبت بھی غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں۔ ان ساری باتوں کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ یونانی آرٹ میں انسان کی جسمانی طاقت کو ہر جگہ نمایاں کیا گیا ہے۔ اور ہندوستانی فن میں انسان کی روحانی زندگی کی بلندی دکھائی گئی ہے۔ یونانی آرٹ میں انسان دنیا کو فتح کرتا ہے اور ہندوستانی آرٹ میں حقیقت حاصل کرنے کے بعد انسان زندگی اور موت کے فلسفہ کو دیکھتا ہے۔ یونانیوں نے اپنے آرٹ میں انسان کے جسم کی حرکتوں کو پیش کیا ہے۔ جسم کی حرکتوں اور لرزشوں اور تھرتھراہٹوں کو فنکارانہ طور پر ظاہر کیا ہے۔ اور ہندوستانی فنکاروں نے اپنے فن میں انسان کے جذبات کے اظہار پر زور دیا ہے۔ جہاں تک رنگ کا تعلق ہے۔ ہندوستانی فنکاروں نے رنگ کا استعمال سمبولک طور پر کیا ہے۔ حقیقی رنگ سے الگ ہوکر رنگ کا مصرف لیا ہے۔ مذہبی خیالات کو پیش کرنے میں کچھ فرق ہوتے

کے باوجود ہندوستانی اور یونانی فنکار ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں
کسی زبان کی زندگی اور اسکی اہمیت کا اندازہ اس
زبان کے بولنے والوں کی تعداد سے نہیں لگایا جاسکتا ہے۔ کوئی زبان اس لئے
اہم اور بڑی نہیں ہوسکتی کہ اس کے بولنے والوں کی تعداد زیادہ ہے۔ اس
طرح دنیا کی بہت ساری زبانوں کے ساتھ ہم انصاف نہیں کرسکیں گے۔ کسی
زبان کی اہمیت، کسی زبان کی تازگی اور شگفتگی اور کسی زبان کی اعلیٰ قدروں
کا اندازہ اس زبان کے بولنے والوں کی تہذیب کی ان جھلکیوں سے کیا جاسکتا
ہے جو اس زبان میں اپنی جگمگاہٹوں کے ساتھ موجود رہتی ہیں۔ چینی زبان
(Chinese Language) اپنی پہلی منزلوں میں بڑی اور اہم زبان نہیں
بن سکی۔ اس لئے کہ عوام کے تمدن اور تہذیب میں ایک قسم کا ٹھہراؤ پیدا ہوگیا
تھا۔ عوام اپنی زبان کو خوبصورت اور نکھرے ہوئے الفاظ نہیں دے سکتے تھے
ان کے تمدن اور ان کی تہذیب کے پاس جو سرمایہ تھا وہ تھوڑا تھا۔ وہ اپنی
زبان کو زیادہ کچھ دینے سے قطعی مجبور تھے۔ یہ بات صرف چینی زبان کے ساتھ
نہیں دنیا کی ان ساری زبانوں کے ساتھ ہے جو اپنی ابتدائی منزلوں میں اپنے
رینگتے ہوئے ثقافتی عناصر کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھیں۔ چینی زبان ہزاروں
برس کی ہر دلعزیز زبان ہے۔ چینی زبان کی تاریخ کو پانچ مختلف دوروں
میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلا دور وہ ہے جبکہ چین کے عوام کا تعلق دوسرے
ممالک کے عوام کے ساتھ قائم نہیں ہوا تھا۔ چین کی تہذیب پر دوسرے ملکوں
کی تہذیب کا کوئی اثر نہیں تھا۔ اس وقت کی شاعری دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی
ہے۔ اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ چینی زبان میں ترقی کے امکانات پیدا کئے جانے
کی جدوجہد شروع ہوگئی تھی۔ دوسرے دور میں کنفوسیس[۲]

اور منیس (Mencius) اور ان کے حامیوں کی تخلیقات نظر آتی ہیں۔ یہ دور پورے ۵۰۰ قبل مسیح تک پھیلا ہوا ہے۔ تیسرے دور میں دو اہم باتیں ہوئی تھیں۔ ۶۰۱ میں یوفایان (Lu-Fa-Yun) کی لغت سی۔ ین (Tsie-Yun) شائع ہوئی۔ جس میں ہر لفظ کے تلفظ کو صاف صاف بتایا گیا ہے۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ اسی دور میں ایک دوسری لغت "چن یاان، ان۔ ین (Chun-yuan-yin-yun) شائع ہوئی جسکی ترتیب کے ذمہ دار "چوتے چنگ" (Choi-te chung) تھے۔ اس لغت سے یہ پتہ صاف طور پر چل جاتا ہے کہ کس طرح اس دور میں چینی الفاظ کی آوازوں میں تبدیلی ہوئی۔ چوتھے دور میں چینی زبان جوان ہوتی ہے۔ اس کے درخت کی ٹہنیاں ہری ہو جاتی ہیں اور اسکی جڑیں عوام کی زندگی کی گہرائیوں میں اتر کر چاروں طرف پھیل جاتی ہیں۔ اسے اپنی زندگی کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ حملے پر حملے ہوتے ہیں لیکن اس زبان ان حملوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ دوسرے ممالک سے آئی ہوئی قوموں کی زبانوں کا بھی اس زبان پر خراب اثر نہیں ہوتا۔ باہر سے آئے ہوئے آقاؤں کی زبانیں بھی اس کے سامنے سر نیچے کر دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں چینی ڈراموں اور چینی ناولوں کی تخلیق ہوئی۔ اور زبان و ادب کو آگے بڑھنے کا موقع ملا۔ عوام نے اپنی زبان کو پیار کیا اور سینوں سے لگایا۔ اور اسے اپنے تمدن اور تہذیب کی اٹھتی ہوئی دیواروں کی سرحدوں میں سنبھل سنبھل کر اتارا۔ اس زبان کی ہمہ گیری دوسرے ممالک کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکی۔ کوریا کی زبان (Korean Language) نے چینی رسم الخط (Script) کو اپنا لیا۔ (تیسری صدی قبل مسیح) اور جاپانی زبان نے بھی

چینی زبان اور چینی رسم الخط سے بہت اثر لیا۔ کورین اور جاپانی نے چینی زبان کے بے شمار الفاظ لے لئے اور کچھ عرصہ تک چینی تلفظ کو بھی نبھایا چونکہ چینی زبان کی آواز کو نقل کوریا اور جاپان کے لوگ نہیں کر سکتے تھے اسلئے رفتہ رفتہ آواز میں تبدیلی آتی گئی۔

قدیم چین کی زبان کسی بڑے حلقہ کی زبان نہیں تھی۔ یہ زبان ان دریاؤں کے کنارے بولی جاتی تھی۔ جن کے قریب قدیم چینی کاشت کرتے تھے۔ انسان کی اجتماعی جدو جہد نے اس زبان کا پودا لگایا تھا۔ اور اسے زندگی دے دی تھی۔ انسان اجتماعی طور پر دریاؤں کے کنارے محنت کرتا تھا۔ زمین کے سینے سے اناج نکالتا تھا۔ لکڑیاں کاٹ کر کشتی بناتا تھا۔ پتھروں سے شکار کھیلتا تھا۔ محنت کو ہلکا کرنے کے لئے گیت گاتا تھا۔ خوبصورت عورتوں کی قدر کرتا تھا۔ یہی اسکی تہذیب تھی۔ اور اسی تہذیب کا اثر اسکی زبان پر گہرا ہوتا تھا۔ دوسرا دور (Archaic Period) چین کی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس لئے کہ اس دور سے (۵۰۰ سال قبل مسیح) چین کی لسانی تاریخ میں ایک اہم موڑ پیدا ہوتا ہے۔ چاؤ (Chou) کی عظیم سلطنت میں زلزلہ آگیا تھا۔ چھوٹے چھوٹے راجے آپس میں لڑ رہے تھے۔ سلطنت آو (Wu) اور اس قسم کی دوسری ریاستوں کی سرحدیں مضبوط ہو رہی تھیں۔ اسکی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چینی زبان کا دائرہ آہستہ آہستہ بہت وسیع ہو رہا تھا۔ یہ ماحول کی نئی طاقت کو پیدا کرنے کے لئے زمین ہموار کر رہا تھا۔ ملک کی ایک ایسی نئی طاقت کی ضرورت تھی جو ٹوٹی دیواروں کی جگہ نئی دیواریں اٹھا سکے۔ اور سارے بیکار ہنگاموں کو روک سکے۔ چو خاندان نے اپنی طاقت سے اسکی ہر ممکن

کوشش کی۔ اس خاندان کا پانچواں حکمراں شی ہونگ تی Shih-Huang Ti (ایک بڑی شخصیت کا مالک تھا۔ اس نے چین کی طاقت بڑھائی اور اس کے لئے اس نے بہت ساری چھوٹی ریاستیں توڑ ڈالیں۔ پڑھے لکھے اور سمجھدار طبقہ کے ساتھ اور خصوصاً شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ اسکا برتاؤ اچھا نہیں تھا۔ وہ سیاسی دنیا میں کچھ اس طرح کھویا ہوا تھا کہ اسے اسکے علاوہ دوسری کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی۔ شاعروں پڑھے لکھے لوگوں اور سمجھداروں کے ساتھ چونکہ اسکا رویہ اچھا نہیں تھا۔ اس لئے تاریخ لکھنے والوں نے شی ہونگ تی (Shih Huang Ti) کے ساتھ بے مروتی برتی ہے اور جا بجا بے انصافی بھی کی ہے۔ اسکی شخصیت میں بہت ساری خامیوں کے باوجود چند باتیں ایسی تھیں جن کا احترام تاریخ والوں کو کرنا لازمی تھا۔ شی ہونگ تی کی کلبیّت (Cynicism) اس وقت کے لئے کچھ ضروری تھی۔ ورنہ وہ اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ شی ہونگ تی کے ساتھ لاکھ بے انصافی ہو چین کی صحیح تاریخ جاننے والے اس سے انکار نہیں کر سکتے۔ کہ صحیح معنوں میں اسی کے عہد میں چین کی تہذیب، چین کے عوام اور زبان کے متعلق مغربی ممالک نے پہلے پہل کچھ جانا تھا۔ ورنہ اسکے قبل چین تاریکیوں میں پڑا ہوا تھا۔ اور اسکے کلچر کے متعلق مغربی ممالک کو کچھ بھی پتہ نہیں تھا۔ اسکے خاندان نے چینی زبان کو آگے بڑھانے اور پھیلانے میں بہت مدد دی ہے اور اسی مدد کی وجہ سے چینی زبان کی اہمیت کو چین کے باہر لوگوں نے سمجھا اور اس زبان کی وسعتوں کو دیکھتے ہی دیکھتے رہ گئے۔ چینی زبان کو جو وسعتیں ملیں اسکی سب سے بڑی وجہ یہ تھی۔ کہ اس خاندان کے حکمران

اپنے گذرے ہوئے حکمران سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھتے تھے۔ پرانے حکمرانوں کی شان و شوکت، ان کا جلال و جمال، ان کی رہائش اور ان کے بولنے کے طریقوں کا نئے حکمرانوں پر کوئی اثر نہ تھا۔ انہوں نے پرانی روایتوں کو آگے نہیں بڑھایا۔ نئے حکمرانوں نے پرانی شاہی زبان کو رد کر دیا۔ وہ اس زبان کی تصنع اور بناوٹ سے گھبراتے تھے۔ ان کی اپنی زبان نے ترقی کے نئے راستے کھول دئے اور زبان میں تبدیلیاں کیں انہیں بڑھایا اور نکھارا۔ اسی دور (Archaic Period) کے آخیر میں بدھ مذہب چین میں آیا۔ اور پھیلا۔ بدھ مذہب نے چین کی زبان کو جتنا متاثر کیا ہے۔ اسکا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ بدھ دھرم کی باتوں کا ترجمہ چینی زبان میں ہوتا رہا۔ اس طرح تقیباتی طور پر عوام میں اپنی زبان کو نکھارنے کا خیال اور جذبہ پیدا ہوا۔ اور عوام نے شعوری طور پر اسکی جدوجہد کی۔ ان کی دلچسپی اپنی زبان سے بڑھ گئی۔ سنسکرت کے فلسفیانہ الفاظ اور سنسکرت کے خاص ناموں کے لئے چین کی زبان میں الفاظ تراشے گئے۔ ان الفاظ کے مطالعہ سے دونوں ممالک (ہندوستان اور چین) کے تلفظ کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ چینی زبان میں سنسکرت کے بہت سارے الفاظ لے لئے گئے۔ ان باتوں سے بدھ مذہب کے ان اثرات کا پتہ چلتا ہے۔ جن سے عوام اچھی طرح متاثر ہوئے تھے۔ (یہ پہلا موقع تھا کہ چینی زبان میں کسی دوسرے ملک کے الفاظ شریک ہو رہے تھے) یہ دوسری بات ہے کہ سنسکرت اور پالی کے بہت کم الفاظ اپنی اصلی صورت میں رہ سکے۔

جب چان خاندان نے اپنی بے پناہ کمزوریوں کی وجہ سے

سے دم توڑ دیا تو ملک میں ایک خلفشار ہو گیا۔ آپس کی نا اتفاقی ہر لمحہ بڑھتی گئی۔ آپس کی جنگوں نے عوام کو نہایت ہی کمزور کر دیا۔ ملک مختلف حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ اور یہ بات چھٹی صدی تک قائم رہی۔ اس صدی کے قبل ملک کی تقسیم برابر رہی۔ سینگ خاندان (sang dynasty) تین صدی تک زندہ رہا۔ یہی وجہ ہوئی کہ سینگ خاندان کے حکمرانوں نے چین کی حکومت کو بہت زیادہ بڑھایا۔ اس زمانہ میں چین کی ادبی زبان کو ایک اچھی صورت، ایک نکھری ہوئی ہیئت اور ایک ستھرا اسلوب ملا۔ نثر اور نظم دونوں میں زندگی کی نئی لہریں پیدا ہو گئیں۔ نئے محاورے، نئی تشبیہوں کا رواج ہوا۔ تحقیقات سے پچاس ہزار اچھی نظموں کی تخلیق کا پتہ چلتا ہے۔ اس وقت کی شاعری سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ اس زمانہ کی زبان اپنے گذشتہ دور سے گہرا تعلق رکھتی تھی۔ عوام چوں کہ مختلف طبقوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ اس لئے ان کی زبان کی بھی صورت ہر طبقہ میں کچھ تبدیلیوں کے ساتھ پیدا ہوتی تھی۔

سانگ خاندان کے ختم ہوتے ہی ملک کی تقسیم نے ایک نئی صورت اختیار کر لی۔ تاتاری اور تنگوس (Tungus) قبیلوں نے شمالی چین پر دھاوا بول دیا اور وہاں حکومت شروع کر دی۔ ان قبیلوں نے سینگ خاندان کے ادبی سرمایہ میں آگ سی لگا دی۔ یہ ظاہر ہے کہ ان قبیلوں نے یہ سب کچھ وہاں کیا۔ جہاں چینی ادب کی جڑیں لگی ہوئی تھیں اور جہاں کے عوام نے اپنے ادب اور اپنی زبان کی خاطر خونِ جگر پیش کیا تھا۔ اس ادب کا سرمایہ عوام کی زبان میں اپنی جڑیں رکھتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شمال سے لوگ جنوب کی طرف گئے اور جنوبی چین میں پناہ لی۔ پڑھے

لکھے لوگوں کا تعلق شمال سے ختم ہو گیا۔ اس کا اثر شمال چین کی زبان پر گہرا ہوا۔ اس زبان کی مادی خصوصیتیں آہستہ آہستہ دم توڑنے لگیں جنوبی چین کو سینگ خاندان کی حلاجبنشی ہوئی زبان بھی ملی۔ اور ادب کے خوبصورت اسلوب بھی ملے اور ادب کا ایک اچھا خاصہ سرمایہ بھی ملا۔

یہ ساری چیزیں فیوکن (Fukien) کی بولیوں میں گھل گئیں اور فیوکن کی بولیوں سے ان کا تعلق گہرا ہوتا گیا۔ یانگ سی (Yangtsze) کے دکن میں تہذیب کا ایک نیا مرکز قائم ہوا۔ جس نے ایک نئے علاقہ کے ساتھ ایک نئی علاقائی بولی کو بھی جنم دیا۔ جس کی مدد سے عوام ایکدوسرے کو اچھی طرح سمجھنے لگے۔ اور ان کے تعلقات بہتر سے بہتر بنتے گئے۔

لوفایان (LU-FA-YUN) کی لغت سی یُن (Tsie-Yun) اور چونے چنگ (chon-te chung) کی لغت چن یان ان یُن (chun-Yuan-Yin-Yun) اسی زمانہ میں شائع ہوئی تھیں۔ جن کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ قدیم چینی زبان (Ancient chinese) کی چند مثالیں دیکھئے:۔

بادشاہ

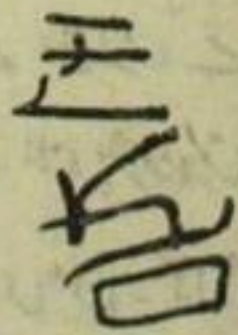

میرا

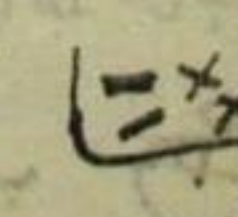

زمین

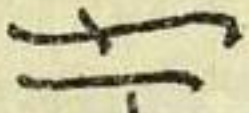

خلاف

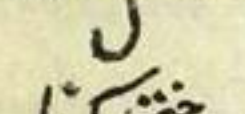

ختم کرنا

نفع

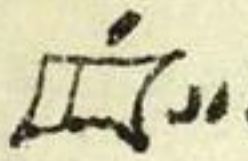

اور

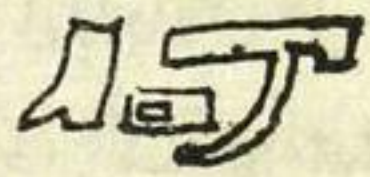

کیسے

ضرور

کہو

آؤ

ایک کناڈین نے پچاس ہزار سے زیادہ ایسی ہڈیاں دریافت کی ہیں جن سے شینگ خاندان کے رسم ورواج کا پتہ چلتا ہے۔ چین کے قدیم تمدن پر ان ہڈیوں کے نشانوں سے بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ ہڈیوں پر تصویریں بنی ہوئی ہیں۔ ان ہزاروں تصویروں میں قدیم چینی تمدن کے نقوش اچھی طرح نمایاں ہیں۔ کناڈا کے اس شخص نے ہونان کی ہڈیوں کا جائزہ اچھی طرح لیا تھا۔ ان ہڈیوں کی بعض تصویریں یہ ہیں:-

(چینی) شراب

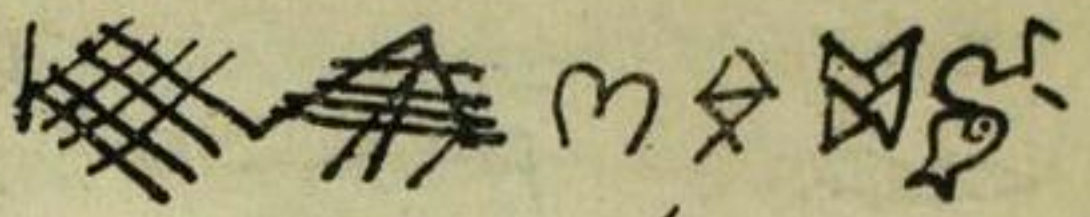

مچھلی پکڑنا (یو)

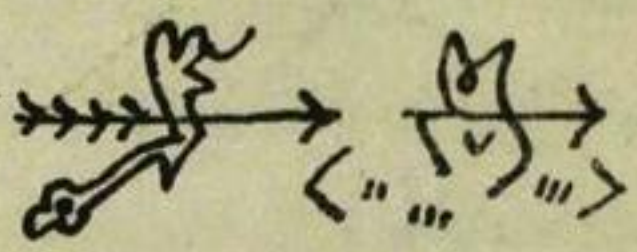

شکار کرنا (یہہ)

مندرجہ ذیل الفاظ سے قدیم اور جدید نشانوں کے فرق کا علم ہوگا:۔

معنی	جدید	قدیم
آدمی		
عورت	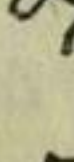	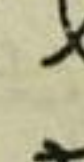
کنواں	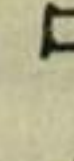	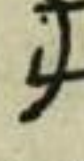
کچھوا	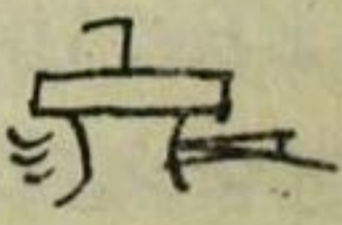	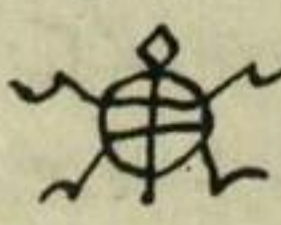
بچہ	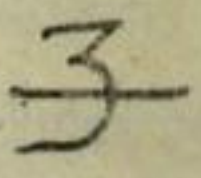	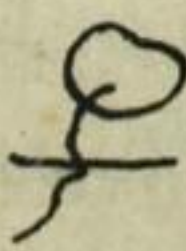
آنکھ	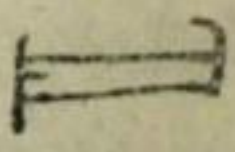	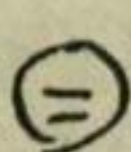
سانپ	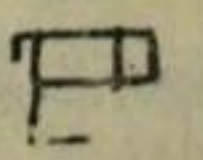	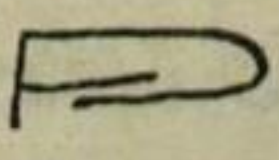
ہاتھ	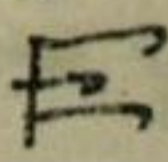	

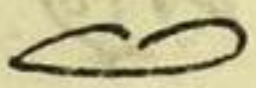

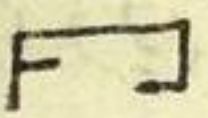

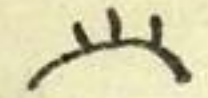

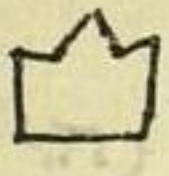

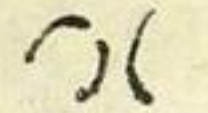

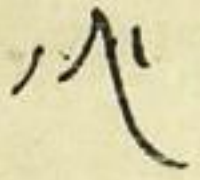

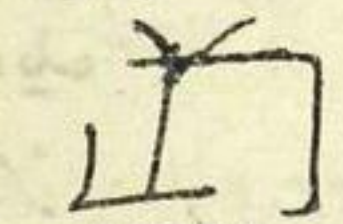

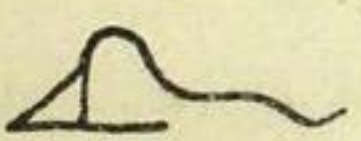

تینگ خاندان کا جب کوئی اثر شمالی چین پر نہیں رہا تو منگول شمالی چین پر چھا گئے۔ پھر منگ خاندان (Ming) نے حکومت کی اور پھر مانچوس آئے۔ ان سارے ہنگاموں نے زبان کے ارتقاء پر براہ راست کوئی اثر نہیں ڈالا۔ منگول اور مانچوس زبانیں عوام میں مقبول نہیں ہو سکیں۔ منگول اور مانچوس زبانوں سے عوام کو کچھ الفاظ ضرور ملے لیکن ان کی صورت بدل گئی تھی۔ اور یہ بگڑی ہوئی صورت بھی منگول اور مانچوس تہذیب کے ساتھ ختم ہو گئی۔ مانچوس حکومت نے اپنی زبان پھیلانے کی بہت کوشش کی۔ عوام پر دباؤ ڈالا۔ گاؤں اور دیہاتوں میں زبان کی تبلیغ کی لیکن ان کا کوئی اثر نہ ہوا۔ دباؤ سے عوام نے کچھ الفاظ قبول کر لئے لیکن وہ الفاظ مانچوس تہذیب کے ساتھ ختم ہو گئے۔ چینی زبان اس وقت

ایسی منزل پر پہنچ چکی تھی۔ کہ اس پر ان نئی زبانوں کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا تھا۔ جن کی بنیاد کمزور تھی۔ جن میں عوام کے شعور کو متاثر کرنے کی صلاحیت نہیں تھی اور جن کا دائرہ نہایت ہی محدود تھا۔ چینی زبان کے بولنے والوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ غیر چینی قوم کی تہذیب میں اتنی کشش نہ تھی کہ وہ عوام کو اچھی طرح متاثر کر سکتی۔ چینی اور غیر چینی زبانوں کا تعلق اسی وجہ سے گہرا نہ ہو سکا اور جو تعلق رہا اس سے چینی زبان کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ چینی زبان جس منزل پر پہنچ چکی تھی وہاں اس کے مٹنے یا برباد ہونے کا قطعی کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اور نہ اسکا خطرہ تھا کہ وہ برسر اقتدار حکومت کی جماعتوں سے گہرے طور پر متاثر ہو کر کسی لمحہ نیچی سطح پر آجائے۔ منگولوں نے بڑی محنت اور کوششوں کے بعد شمالی چین کی مادری زبان کو سمجھا اور اسے اپنایا۔ اور اسی قوم کے اثر سے چینی ڈرامہ اور چینی ناولوں کی بنیاد پڑی۔ اس سے ظاہر ہے کہ غیر چینی قوم چینی زبان کے اس تعلق کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔ جو عوام سے پیدا ہو گیا تھا۔ بغیر اس تعلق کی گہرائی کے شدید احساس کے منگول شمالی چین کی مادری زبان کو سمجھنے اور اسے اپنا لینے کی کوشش نہیں کرتے۔ وہ اسکی کوشش البتہ کرتے رہتے کہ ان کی تہذیب اور ان کی زبان سے چینی عوام ہر لمحہ متاثر رہیں

چینی زبان ہزاروں سال سے دنیا کے ایک ایسے حصہ میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ جہاں کی آبادی دنیا کی آبادی کا پانچواں حصہ ہے۔ یہ زبان ایک تہذیب یافتہ قوم کی زبان ہے۔ اسے مٹانے کی بھی کئی بار سخت کوششیں ہوئی ہیں لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ عوام کی بیداری کے ساتھ ساتھ اس زبان میں نئے الفاظ آتے گئے۔ نئے خیالات آتے گئے۔ اور نئے تجربوں نے اس زبان کو بہت ساری رعنائیاں بخش دیں۔ یہ ایک ہمہ گیر

زبان ہے اور مستقبل میں کبھی بھی لسانیات کا مطالعہ چینی زبان کے مطالعہ کے بغیر ممکن نہیں ہوگا۔ ہزاروں برسوں میں زندگی کے ہر شعبہ میں یہ زبان اپنا کام کرتی رہی ہے۔ ادبی، سائنسی، قانونی اور ذاتی اور انفرادی زندگی میں اسکے اثرات ہر وقت اور ہر لمحہ موجود رہے ہیں۔ دوسرے ممالک نے ہمیشہ چینی زبان کی مدد سے اپنی تہذیب اور اپنے تمدن کو سنوارنے میں مدد لی ہے۔ چین کے قریبی ملکوں پر تو خاص طور پر چینی زبان کا بڑا احسان ہے چینی زبان نے یونانی اور لاطینی زبانوں کی طرح الفاظ اور محاورے نہیں دیئے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس زبان کی مدد کے بغیر قدیم تمدن کی تصویر میں کوئی خاص رنگ بھی بھرا نہیں جاسکتا...... یعنی اس کے بغیر انسان کے قدیم تمدن کے پوشیدہ خزانوں کا پتہ نہیں لگایا جاسکتا ہے۔ ہبریو زبان کی طرح اس زبان میں مقدس لٹریچر نہیں ہے۔ لیکن اس زبان کی تاریخ میں چین کے عوام کی تاریخ ہے۔ چینی عوام کی تہذیب کا پتہ اس زبان کے بغیر نہیں چل سکتا..... اس زبان میں بڑی پاکیزگی ہے اور یہی پاکیزگی اس زبان کو ہر طرح سے مکمل کرتی ہے۔ اس زبان نے اپنی زندگی کے نقوش کو ہمیشہ ابھارا ہے اور فکر و احساس اور فکر و نظر میں وسعت پیدا کی ہے۔ اس میں اس زبان کے بولنے والوں کی تہذیب کا گہرا عکس ہے۔ یہی اسکی بڑائی ہے اور اسی کی وجہ سے اسکی انفرادیت روشن ہے۔

چین کی مختلف بولیوں میں سینو کورین (Sino Korean) کاؤ۔ اون (Kau-on) کینٹونیز (Cantonese) سینو انامیز (Sino-Annamese) فوچو (Fuchow) ہکا (Hakka) ٹنگ چو (Tang chow) او (Wu) ہیں من (Min) کی بہت

اہمیت ہے۔ ان بولیوں کے مطالعہ سے چینی زبان کی ہمہ گیری کا احساس شدید ہو جاتا ہے۔ ان بولیوں کے مطالعہ سے بھی چینی عوام کے اس تعلق کا علم ہوتا ہے۔ جس تعلق نے چینی زبان اور مختلف دور کے عوام میں گہرا ربط پیدا کر دیا ہے۔ چینی عوام کی تاریخ ان کی نفسیات اور ان کے سماجی ردو بدل اور تغیر کی تصویریں ان بولیوں کے سہارے مکمل ہو جاتی ہیں۔ مندارن زبان (Mandarin) چاٹنا سی برما کی سرحد تک بولی جاتی ہے اور پھر منچوریا سے یانگ سی کے جنوب تک اسکا گہرا اثر ہے۔ شنگھائی کے جنوب سے ٹانکنگ کی سرحدوں تک اس زبان کا نام و نشان نہیں ملتا ہے۔ یوں وہ اثرات موجود ہیں جو ایک زبان دوسری زبان پر چھوڑتی ہیں لیکن یہ علاقہ اس زبان سے بہت دور ہے۔ مثلاً چھکیانگ، فیوکن اور کون ٹنگ کے علاقوں میں مندارن زبان کے اثرات نہیں ہیں۔ یا یہ کہا جائے کہ یہ علاقے اس زبان کے علاقے نہیں ہیں۔ ہونگ کانگ، کنتون، اموئے فوچو کی بولیاں بھی علیحدہ ہیں۔

جدید تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ تین ہزار سال قبل مسیح کے قریب چین کی رزد مٹی والی زمین پر لوگوں کی ایک بڑی آبادی تھی لیکن یہ بات اب تک نہیں کہی جا سکتی۔ کہ وہ کون لوگ تھے اور کہاں سے آئے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ لوگ کاشتکاری کے لئے اس زمین پر آئے تھے۔ کاشتکاری کے علاوہ وہ لوگ مٹی کے برتن بھی بناتے تھے۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ چین اور ہندوستان میں بہت قبل سے زراعت کرنے والے موجود رہے ہیں۔ چین میں بھی یونان کی طرح چھوٹی چھوٹی شہری ریاستیں قائم تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ چین کا پہلا بادشاہ "یاؤ"

تھا۔ جس نے چین کو کافی مضبوط کیا تھا۔ اور مختلف ریاستوں کو متحد کیا تھا۔ "یاؤ" نے "تبدیو" کا نام ملتا ہے۔ اس نے ہیا خاندان" کی بنیاد ڈالی تھی۔ "یو" نے زراعت کو کافی ترقی دی۔ آبپاشی کے نئے طریقے نکالے اور دریاؤں میں طوفان سے بچنے کے لئے پل نکالے۔ قدیم ترین تاریخی روایتوں سے پتہ چلتا ہے۔ کہ "یو" چین کا وہ پہلا بادشاہ تھا جس نے نہریں بنوائیں تھیں اور جنگل صاف کر کے کاشتکاری کے لئے میدان تیار کئے تھے۔ اسکے وقت میں ریشم، روئی، موتی اور قیمتی پتھروں کی بہت قدر تھی۔ اس وقت چینی اوہام پرستی میں مبتلا تھے۔ اور بعض عجیب باتوں پر اعتقاد رکھتے تھے۔ اس سلسلہ میں ایک اور بادشاہ "فوہ" کا نام ملتا ہے۔ اسکے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے زندگی کے کچھ خاص اصولوں پر زور دیا۔ اور انسان کو درندگی سے دور رکھنے کی کوشش کی۔ اسکے وقت میں بھی لوگ اوہام پرستی میں مبتلا تھے۔ بات بات پر سخت سزائیں ملتی تھیں۔ مٹی کے برتنوں، پتھروں اور سنکھوں سے موسیقی پیدا کیجاتی تھی۔ بادشاہ کی رائے کے ساتھ عوام کی رائے کی بھی اہمیت تھی۔ دو ہزار سال قبل مسیح جس میں ہیا بنہ خاندان کی حکومت تھی۔ قدیم روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس خاندان کے سولہ بادشاہ تھے۔ آخری بادشاہ نے عوام کو کافی تکلیف پہنچائی۔ وہ عیاش انسان تھا۔ چینی ادب میں اس کے متعلق بہت ساری باتیں ملتی ہیں۔ اس خاندان کے خاتمہ کے بعد ین خاندان (Yun Dynasty) نے حکومت شروع کی اس خاندان نے سماجی زندگی میں بہت ساری تبدیلیاں کیں۔ ین خاندان کا آخری بادشاہ چاؤ سن تھا۔ جو سُو کی ریاست کی ایک فاحشہ عورت کے عشق میں مبتلا ہو کر تباہ ہو گیا۔ وہ عورت قتل کر دی گئی۔ اور چاؤ سن نے محل میں آگ لگا کر

خودکشی کرلی۔ چین کی قدیم کتابیں اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ چاؤسن بہت ہی ظالم اور عیاش انسان تھا۔ غریبوں پر اس نے بہت ظلم کئے تھے وہ غریب کسانوں کو اس لئے قتل کرا دیتا تھا کہ اسے ان کسانوں کے سر کے اندر کی چیزیں نظر آجائیں۔ وہ اپنی مسرت کے لئے انسان کو جلاتا تھا۔ عورتوں کے جسم کے خاص حصوں کو تراش کر اس سے لطف حاصل کرتا تھا۔ ہسپانیہ باہیہ خاندان کے بعد شینگ یا ین خاندان نے حکومت کی۔ اس خاندان کی حکومت کم و بیش سات سو برس تک قائم رہی۔ ایک انقلاب نے اس خاندان کا تختہ الٹ دیا۔ اور ایک نیا خاندان "چو" آیا۔ اس خاندان نے شینگ خاندان سے بھی زیادہ حکومت کی۔ "چو" خاندان نے چینی حکومت کو کافی مضبوط کیا۔ کنفوشیش (Confucius) اور لوسے (Lao-Tse) اسی زمانہ کے بڑے فلسفی تھے۔ ان دونوں کے فلسفوں نے عوام کو ذہین کو کافی متاثر کیا۔ جب شینگ خاندان کا خاتمہ ہوا۔ تو اس خاندان کا ایک بڑا حاکم "کی سے" (Ki-Tse) پانچ ہزار ہمنواؤں کے ساتھ کوریا چلا گیا۔ اس نے "چو" خاندان کی حکومت میں رہنا پسند کیا تھا۔ کوریا کے متعلق چینی عوام کو کی۔ سے۔ کے بعد ہی دراصل بہت کچھ معلوم ہوا۔ کی۔ سے نے کوریا کا ایک دلکش نام "صبح کی خاموشی کا وطن" رکھا۔ انہیں چینیوں کے بعد کوریا کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ "کی۔ سے" اور اس کے ہمنواؤں کے ساتھ کوریا میں ایک، ہزار ایک سو برس قبل مسیح چینی فن اور چینی تحریر کے نمونے پہنچے۔ کوریا میں بھی چین کے مکانوں کی نقالی ہوئی۔ کھیتی کے طریقے اور ریشم تیار کرنے کے ڈھنگ بھی کوریا کے لوگوں نے چینیوں سے سیکھے۔ کی۔ سے (Ki-Tse) اور اس کے ہمنواؤں کے جانے کے بعد چین سے اور بھی بہت سارے لوگ

کردیا پہنچے -کی۔ سے کی حکومت وہاں بہت مضبوط ہو گئی - اور اس کے خاندان کے لوگوں نے کم و بیش نو سو سال حکومت کی۔ چین میں "چو" خاندان کی حکومت میں ملک میں انتشار پھیل گیا۔ چھوٹی چھوٹی حکومتوں نے لڑنا شروع کر دیا۔ کئی سو برسوں تک یہ حالت رہی۔ ایک حکمران "چن" (chin) نے "چو" (chou) خاندان کا شیرازہ بکھیر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اسی کے نام سے اس ملک کا نام چین ہوا ہے۔ چن خاندان میں وانگ چنگ (wang cheng) کا نام کافی اہمیت رکھتا ہے۔ وانگ چنگ اس خاندان کا پانچواں بادشاہ تھا۔ اسی نے اپنا نام بدل دیا تھا۔ تاریخ میں "شی ہونگ تی" اسی کا نام ہے۔ اس نام کے معنی "پہلے شہنشاہ" کے ہوتے ہیں۔ "شی ہونگ تی" نے اس کی کوشش کی کہ لوگ اپنی تاریخ بھول جائیں ماضی کی تمام روایتیں فراموش کر جائیں۔ انہیں صرف اس کا خیال رہے کہ وانگ چنگ، شی ہونگ تی ہے یعنی چین کا پہلا شہنشاہ ہے اور چین کی تاریخ اسی سے شروع ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے اس سلسلہ میں کافی سختی کی۔ ماضی کی خوبصورت اور اچھی روایات کو بھی فراموش کرنے پر مجبور کیا۔ کنفیوشیس اور لوسی کے فلسفوں کو بھی ذہن سے نکال دینے کو کہا۔ نتیجہ کے طور پر ان گنت کتابیں جلا دی گئیں۔ چین کا ماضی آگ میں ڈال دیا گیا۔ مفکروں کے خیالات، فلسفیوں کے فلسفے، حکیموں کے نسخے، بادشاہوں کی تاریخ، عوام کی حالت کی داستانیں سب کچھ جلا دی گئیں۔ کنفیوشیس اور لوسے کے خیالات جہاں بھی لکھے ہوئے ملے نذر آتش کر دئے گئے۔ کچھ مورخین کہتے ہیں کہ دواؤں کے نسخوں کو بچانے کی کوشش کی گئی۔ اس وقت چین کے لوگوں کے سامنے ایک عجیب مسئلہ

تھا۔ اپنی تاریخ کو فراموش کرنا اور ساتھ ساتھ ساری قدیم یادگاریں کو ختم کر دینا۔ چین کے لوگوں نے اپنے طور پر بہت کچھ بچانے کی کوشش کی لیکن شہنشاہ کی غضبناک نگاہوں سے وہ سہمے رہے۔ اس جرم میں بہت لوگوں کو قتل کر دیا گیا۔ بہت سارے چینی لوگوں کو اس جرم میں زندہ دفن بھی کر دیا گیا۔ یہی وجہ تھی کہ اس خاندان نے زیادہ دنوں تک حکومت نہیں کی۔ لوگوں میں اس خاندان کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہوا۔ اور یہ آگ پھیلتی رہی۔ "شیہہ ہونگ تی" کے مرتے ہی اس خاندان کا خاتمہ ہوا۔ اس خاندان نے صرف پچاس برس حکومت کی۔ دو سو برس قبل مسیح جب اس خاندان نے آخری ہچکی لی۔ تو اس کا پتہ چلا کہ عوام اپنے ماضی کی یاد دل میں لئے بیٹھے تھے۔ بادشاہ کی سختیوں کے باوجود ان کے دل و دماغ سے ماضی کے خوبصورت نقوش نہیں مٹے تھے۔ سینکڑوں قدیم کتابیں جو بادشاہ کے خوف سے زمین میں چھپا دی گئی تھیں۔ نکالی گئیں۔ چین کے عوام کے سامنے چین کا ماضی پھر آگیا تھا۔ کنفیوشیس اور لوسے کے خیالات بھی لوگوں کے سامنے تھے۔ کلاسکی ادب کے نمونے بھی نکلے۔ چین میں شیہہ ہونگ تی کی کوئی روایت آگے نہیں بڑھی۔ البتہ چین کی دیوار ضرور آگے بڑھی جس کی تعمیر شیہہ ہونگ تی نے شروع کی تھی۔ دیوار چین کی تعمیر کے ساتھ ساتھ چین میں اتحاد اور امن کی کوشش بھی جاری رہی۔ اور اس سلسلے میں لوگوں کو کافی کامیابی ہوئی۔ اس خاندان کے بعد "ہان خاندان" نے حکومت کی۔ چار سو برس تک اس خاندان کی حکومت رہی۔ اس میں ایسی عورتیں بھی نظر آتی ہیں جنہوں نے حکومتیں کی ہیں۔ وو۔ تی (۱۴۰ - ۸۷) اس خاندان کا مشہور بادشاہ تھا۔ اس نے تارتاریوں کو شکست دی تھی۔ اس نے

اپنی حکومت کافی پھیلا دی تھی۔ رومیوں اور چینیوں کے تعلقات بھی اسی کے عہد میں قائم ہوئے اور بہت خوشگوار رہے۔ "ہان خاندان" ہی کے زمانہ میں بدھ ازم کی اشاعت زیادہ ہوئی۔ بدھ ازم نے چین میں اس وقت قدم رکھا جب اس خاندان کا ستارہ عروج پر تھا۔ بدھ ازم کے ساتھ چین میں ہندوستانی فن کے مختلف نمونے آئے۔ ہندوستانی فنونِ لطیفہ نے چین کے عوام کو متاثر کیا۔ اور بدھ ازم کے ساتھ کوریا اور جاپان میں بھی لوگوں نے کافی دلچسپی لی۔ اس خاندان کے عہد میں ایک اور بڑی بات ہوئی۔ لکڑی کے بلاک سے چھپائی شروع ہوئی۔ چین کے تاجر ہندوستان۔ ایران، ترکستان آئے۔ چین کا تجارتی مال تبت کے راستوں سے چینی ترکستان اور پھر کشمیر اور ہندوستان کی دوسری ریاستوں میں آتا تھا۔ چینی سمرقند اور تاشقند کے راستوں سے ایران جاتے تھے۔

"ہان خاندان" کے خاتمہ کے بعد بھی چینی فنون لطیفہ کی ترقی ہوتی رہی۔ مصوّری اور نقاشی میں نئے انداز سمٹ آئے۔ عمارتوں کے نئے نمونے تیار ہوئے۔ جنوبی چین میں سونگ خاندان کی حکومت میں چینی ادب نے جتنی ترقی کی ہے اسے کون فراموش کر سکتا ہے۔ چینی شاعری میں تو جان سی آگئی۔ بہت سارے شعرا پیدا ہوئے۔ چائے دریافت ہوئی۔ چائے کی پیالیوں پر چینی شاعروں نے بہت ہی پیاری نظمیں لکھی ہیں۔ چینی آرٹ کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ بعض مغربی ماہرین کا یہ خیال بالکل درست نہیں ہے کہ چینی آرٹ پر شروع میں مغربی اثرات پڑے تھے۔ چینی آرٹ کی ابتدا بارہویں صدی قبل مسیح سے ہو جاتی ہے۔ تاریک زمانے سے گذر کر یہ آرٹ بہت آگے آیا ہے۔ دنیا کے کسی ملک کا فن اتنی دولت جمع نہیں کر سکا جتنی

دولت چینی آرٹ میں ہے۔ چین میں فن کار ناموں کی کی ایک مکمل تاریخ ہے۔ یونانی آرٹ سے چینی آرٹ کا مقابلہ ایک بیکار سی بات ہے اس لئے کہ دونوں آرٹ کی ابتداء اور دونوں کا ارتقا مختلف ماحول میں ہوا ہے۔ جمالیاتی احساس میں کتنی لطافت تھی۔ خیالات میں کتنی ہم آہنگی تھی اور اظہار میں کتنا جادو تھا۔ ان ساری باتوں کا احساس قدیم چینی آرٹ میں ہوتا ہے۔

بدھ ازم نے ہندوستان سے چین پہنچ کر چینی آرٹ کو کافی متاثر کیا۔ چینی آرٹ میں ہندوستانی آرٹ کے اشارے اور سمبول شامل ہوئے۔ قدیم چینی برتنوں اور دوسری چیزوں پر ان اشاروں اور سمبل کا استعمال خوب ہوا ہے۔ مجسمول اور مصوری کے نمونوں میں بھی یہ اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ چینی آرٹ نے ایشیائی آرٹ کو عروج اور عزت اور عظمت دی ہے۔ ایشیائی آرٹ کی چاشنی کا گہرا احساس اسی وقت ہو جاتا ہے جب ہماری نگاہیں قدیم چینی چیزوں پر پڑتی ہیں۔ ایشیا کی تہذیب اور کلچر کی روح اتر آتی ہے۔ چینی آرٹ کی تکنیک نے عرصہ تک دنیا کے فنکاروں کو سوچنے پر مجبور کیا ہے۔ آج بھی مختلف ملکوں میں چینی فن کی تکنیک کو سمجھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یورپ کی مصوری پر چینی آرٹ کا اثر ملتا ہے۔ رنگوں کی تھیوری کو سمجھنے کے لئے جس شعور کی ضرورت ہوتی ہے اسے مصور ہی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ یورپ کے مصوروں کو چینی آرٹ کے رنگوں کو سمجھنے میں کافی دشواری ہوتی ہے کوریائی، جاپانی اور انامائی (Annamese) تہذیب و کلچر پر چینی آرٹ زبان اور ادب کا گہرا اثر ہے۔ کوریا، جاپان اور انتم

کی زبانوں سے بہت سارے قدیم چینی الفاظ کا پتہ چلتا ہے۔ قدیم تلفظ کا بھی علم ہوتا ہے۔ بہت سارے ایسے الفاظ ہیں جو اب چینی زبان میں نہیں ہیں۔ اور کوریائی اور جاپانی زبانوں میں محفوظ ہیں چین میں "ھان" خاندان کی حکومتوں میں بہت ساری سنسکرت کتابوں کے ترجمے ہوئے۔ چینی زبان میں سنسکرت الفاظ داخل ہوئے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت چینی اور سنسکرت آوازمیں کوئی یکسانیت پاتے تھے یا نہیں۔ چین سے بدھ ازم کے نقوش بھی کوریا اور جاپان اور ایم گئے، "تھا" پراجنا" پارا، میتا، سترا کی اشاعت کے بعد چینی مذہب کا پرچار خوب کرنے لگے تھے۔ وہ اُو خاندان کے خاتمہ کا وقت تھا۔ چین خاندان کے آخری حکمرانوں کے وقت کمار جیو چین آیا تھا۔ کمار جیو کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اس نے بہت ساری کتابوں کا ترجمہ کیا اور بدھ مت کی اشاعت میں کافی مدد دی۔ وہ مدھیا میکا اسکول کا نمائندہ تھا۔ ابھی وہ وقت تھا جب "سراوکایانا" sravakayana کے "تیار آگما" کا ترجمہ کیا گیا تھا۔ بدھ مذہب کے متعلق مختلف خیالات پیدا ہوئے۔ اسکے ماننے والے کچھ تو ایسے ہوئے جو صرف فکر اور خیال کی اہمیت کو سمجھتے تھے۔ کچھ ایسے تھے جو اس مذہب کے اصولوں کو سماجی پس منظر میں دیکھتے تھے۔ اس کے اصولوں کی تعلیم کے طریقے بھی مختلف تھے۔ بدھ ازم کے متعلق مختلف ڈھنگ سے سوچا گیا۔ مختلف خیالوں نے مختلف اصول بھی تیار کئے۔ چھٹی صدی میں ہندوستانی یوگ اسکول کی کافی ترقی ہوئی۔ بدھ ازم میں یوگ اسکول کی بڑی اہمیت سمجھی گئی۔ بودھی رکی اور رتن متی کے

خیالات ان کے ساتھ چین آئے تو یوگ اسکول کے اصولوں کی اشاعت چین میں خوب ہوئی۔ پانامارتھا بھی اسی سکول کا نمایندہ تھا۔ جو چن خاندان کے عروج کے زمانہ میں آیا تھا۔ اس طرح چین میں چینی بدھ ازم کے کئی اسکول قائم ہو گئے۔ چیہہ آی کا اپنا اسکول تھا۔ مدھیامیکا اور یوگ اسکولوں کے درمیان چیہہ آی کے اسکول (chih-yi-school) کی بھی اچھی خاصی اہمیت تھی۔ یہ مدرسۂ فکر ساتویں صدی کی ابتدا میں قائم ہوا تھا۔ جب چین میں بدھ مذہب کی ایسی حالت ہو گئی تو حقیقت کی تہوں میں جانے کے لئے ہندوستان میں بدھ مذہب کے اصولوں کو سمجھنا ضروری تھا۔ ہیون سیانگ بدھ ازم کی حقیقتوں کی تلاش ہی میں ہندوستان آیا تھا۔ ہندوستان میں اس نے بدھ مذہب کا مطالعہ جس طرح کیا وہ ہمیں معلوم ہے۔ ایک سچے اور ایماندار اور مخلص انسان کی طرح اسے بدھ مذہب کے اصولوں کے سمجھنے کی کوشش کی۔ سترہ برس ہندوستان اور ایسے علاقوں میں رہ کر جہاں بدھ مذہب کے پیرو تھے۔ وہ چین واپس ہوا۔ چین پہنچ کر اس نے بہت ساری تحریروں کا ترجمہ کیا۔ اس کے ترجمہ کی پانچ ہزار جلدیں موجود ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس ترجمے میں اس کی مدد اور بہت سارے لوگوں نے کی تھی۔ لودھی دھرم جو پانچویں صدی کے درمیان چین گیا تھا۔ اس نے ایک اور اسکول کی بنیاد ڈالی جسے دھیانا اسکول کہتے ہیں۔ اس کے بعد اور بھی مختلف اسکول اس سلسلے میں قائم ہوتے رہے۔ ہندوستان سے جب واجرابتی اور اموگھا

چین گئے تو چین میں ایک اندر مدرسہ نکمہ قائم ہوا۔ اس طرح ہندوستان اور چین کے تعلقات بھی گہرے ہو رہے تھے اور ساتھ ساتھ ہندوستان کے اثرات بھی چین پر پڑ رہے تھے ہندوستان سے ہر بار نہ جانے کتنی چیزیں جاتی رہیں اور چین کے عوام اس سے اثر لیتے رہے۔ ساتویں اور آٹھویں صدی میں چین میں بدھ مذہب کی اشاعت کی وجہ سے سنسکرت اور پالی زبانوں کی بھی اہمیت کافی بڑھ گئی۔ یہی وہ وقت تھا۔ جبکہ ایک طرف ہندوستان اور تبت کے تعلقات گہرے ہو رہے تھے اور دوسری طرف چین سے بدھ مذہب تبت کی سرحدوں میں داخل ہو رہا تھا۔ ہندوستان سے بھی تبت بہت سارے بدھ مت کے راہنما گئے۔ اس طرح بدھ مذہب دونوں سرحدوں سے تبت میں اتر رہا تھا۔ اور ساتھ ساتھ کلچرل تعلقات میں جان آ رہی تھی۔

چین کے پاس وہ کلچر ہے جس کا ایک نہ ٹوٹنے والا سلسلہ ہے۔ اس کلچر نے ایشیا کو عظمت دی ہے۔ چینیوں کی زندگی، سادگی، پاکیزگی اور صبر، ان کی فطرت سے محبت، ان کا مزاج، ان کے اختلافات اور ان کی اجتماعی جد و جہد کی ایک بڑی داستان ہے۔ ان کی تاریخ کا مطالعہ ان کی فطرت کے مطالعہ پر اکساتا ہے۔ ان کی فطرت کے مطالعہ میں ان کے سماجی ماحول اور حالات کو پیش نظر رکھنا پڑیگا۔ یہ کہکر دامن نہیں بچایا جاسکتا کہ ان کے اختلافات فطری ہیں۔ ان کے اختلافات کو کلچر کی وہ پیداوار کہنا چاہیئے جو شعوری ہے۔ خود اعتمادی پیدا کرنے کے لئے اور اپنی حفاظت

کے لئے اسکی ضرورت پڑتی ہے - یہ کوئی عظیم اخلاقی صفت بھی نہیں ہے - سماجی حالات کے تقاضے اسے پیدا کرتے ہیں - وائی (Wei) اور چی، آن (Ch'in) خاندانوں کے وقت میں عالموں کے طبقہ کو قومی حالات سے اختلاف تھا - اس طبقہ نے اختلاف کی وجہ سے قومی حالات میں کوئی دلچسپی نہیں لی - قومی طاقت کمزور ہو گئی - نتیجہ یہ ہوا کہ شمالی چین پر بار بربری حملہ ہوا - سیاسی طور پر زندگی میں پستی آ گئی - عالموں کا طبقہ سیاست سے دور ہو گیا اور خیالی دنیا میں اپنی منزل دیکھنے لگا - اس کے برعکس ہان خاندان کے آخری دور میں چینی عالموں کا طبقہ اختلاف کے باوجود سیاست سے دور نہ رہا - اختلاف کو ظاہر کیا - سیاسی تنقید اور نکتہ چینی کی ضرورت محسوس کرتا رہا - اس کی تنقید سے شہنشاہ اور حکومت کے دوسرے ذمہ دار ارکین نہیں بچ سکے - اس وقت کے حالات عجیب تھے - اس طبقہ کی حفاظت کے لئے کوئی قانون نہیں تھا - لہٰذا ان کی تحریک نے دم توڑ دیا - سینکڑوں عالموں کو ان کے خاندان کے ساتھ موت کی سزا دے دی گئی - اس کا رد عمل جو ہو سکتا تھا وہ ظاہر ہے - اس سے ادبا اور شعرا زندگی سے گریز کرنے لگے - اور ایک وقت وہ آیا کہ ان اختلافات نے عالموں، ادیبوں اور شاعروں کو سیاست سے ہٹا کر شراب، شاعری اور عورت کے قریب کر دیا - کچھ لوگ پہاڑوں پر چلے گئے - کچھ عالموں نے اپنی تمام عمر چھوٹے کمروں میں گذاری اور لوگوں کو اپنی صورت نہیں دکھائی - کچھ ادیب اور شاعر جوگیوں سنیاسیوں اور مزدوروں کی زندگی گذارنے لگے کچھ عرصہ کے بعد بعض شاعروں کی عجیب حالت ہو گئی - مشہور شاعر

لونگ (Liu - Lunng) کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ہر وقت شراب پی کر بدحواس رہتا تھا۔ ایک گاڑی میں شراب کی بوتل اور ایک گورکن کو ساتھ لیکر چیختا رہتا تھا۔ "جب میں مر جاؤں تو مجھے دفن کر دینا۔ کسی وقت اور کہیں بھی"

قدیم چین میں رزمیہ نظمیں نہیں ملتی ہیں۔ قدیم چینی ادب میں اس کا کہیں وجود نہیں۔ واقعیاتی نظمیں ہان خاندان کے دور میں ملتی ہیں۔ ڈرامے گیارھویں صدی میں منگول خاندان کے دور میں کافی مقبول رہے تھے۔ بدھ مذہب کے پھیلنے کے بعد کہانیوں کی خوب تخلیق ہوئی۔ خیالی دنیا کے افسانے خوب تراشے گئے۔ چینی مافوق الفطرت (super natural) عناصر بھی انسان کی فطرت کو شامل کرتے رہے ہیں۔ بھوتوں اور پریوں کی کہانیوں میں ہمیں انسان کی کہانیاں نظر آتی ہیں۔ عورتوں کی روحوں کے متعلق بھی دلچسپ اور پیاری باتیں ملتی ہیں۔ عورتوں کی وہ روحیں جو بھوت بن جاتی ہیں وہ مردوں کو پیار کرتی ہیں۔ اور دوسری زندہ عورتوں سے حسد بھی کرتی ہیں۔ مافوق الفطرت عناصر سے ادیبوں نے اپنی تخلیقات میں خوب کام لیا ہے۔ یہ عناصر انسان کو جذبہ اور جوش دیتے ہیں۔ انسان کے غم میں شریک ہوتے ہیں۔ ملکہ آدھو کے دور حکومت میں جو حالات تھے۔ ان کی تصویر کشی اور ملکہ کا کردار بھی موجود ہے۔ چینی ادیبوں نے عام زندگی میں حسن کی ہمیشہ تلاش کی ہے۔ حسن کہاں رہتا ہے؟ یہ سوال قدیم چینی ادیبوں کے ذہنوں میں ہمیشہ رہا ہے۔ وہ اس پر یقین رکھتے تھے۔ کہ زندگی کی سچائی کی تلاش بڑی بات ہے۔ چینی کلاسیکی تعلیم کا ایک بڑا مقصد یہ تھا

کہ کلچر کی عظمت کو قائم رکھنے کے لئے معقول انسان پیدا کئے جائیں۔ انسان کے شعور کی معقول تعلیم ہو اور اس کے لئے کردار بلند کرنے کی کوئی تھیوری یا اس کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ چینی زبان اور گرامر کی فطرت میں بڑی لسانیت ہے فکر کی سادگی، تصور کی پختگی، ذہانت، خاص قسم کی منطق، شرما یا شرما یا سا لہجہ، ہر سخت اصول سے دوری اور پاکیزگی موجود ہے۔ جس طرح عورتیں بات بات میں مثالیں دیتی ہیں۔ اسی طرح چینی زبان بھی یہ ادا دکھاتی ہے۔ چینی مفکروں نے بھی اپنے تصورات کو پیش کرنے کے لئے بڑے اور سخت الفاظ نہیں تراشے۔ مشہور مفکر مینس (Mencius) اور لی (Lichtse) کے پاس بھی ایسے الفاظ نہیں تھے جس میں تیزی اور سختی معلوم ہو۔ چینی مفکروں نے ہلکی پھلکی باتیں کہہ کر اپنے فلسفیانہ تصورات پیش کئے ہیں۔ مثلاً گھوڑے انڈے دیتے ہیں ——— آگ گرم نہیں ہے ——— ایک کچھوا ایک سانپ سے زیادہ لمبا ہے ——— ایک کتا ایک بھیڑیئے سے زیادہ خطرناک ہے ——— انڈے پر بال اُگتے ہیں۔ چوزہ کی تین ٹانگیں ہیں وغیرہ۔

تبت (Tibet) کی زبان کا چینی زبان سے جو تعلق ہے اسے ایک قسم کا اشتقاقی تعلق Etymological Relation) کہہ سکتے ہیں۔ تبت کی زبان نے تحریری صورت اس وقت اختیار کی جبکہ وہاں کا حکمران سرونگ سنگام پو تھا۔ یہ زبان تبتی عوام میں اپنی جڑیں بہت پہلے مضبوط کر چکی تھی۔ سرونگ سنگام پو بدھ مذہب کا ماننے والا تھا۔ اسنے بڑی سرگرمی سے بدھ مذہب کی اشاعت میں حصہ لیا تھا۔ اس وقت تبت کی زبان کی صورت وہ نہ تھی جو آج ہے

تبت کے لوگ بدھ مذہب کے متعلق بہت کچھ جان لینا چاہتے تھے۔ اس لئے ہندوستان کی مذہبی کتابوں (بدھ مذہب کی کتابیں) سے حروف حاصل کئے گئے۔ تبت کے عوام ان ہندوستانی کتابوں سے حروف لیتے وقت اس کا ضرور خیال کرتے تھے کہ ان کی آواز تبت کے لہجہ (Tone) کے قریب ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جو بھی ہندوستانی حروف لئے گئے وہ ان کے لئے قابل برداشت تھے۔ اس لئے کہ لب ولہجہ اور تراش وخراش کا فرق بہت حد تک مٹ چکا تھا۔ یہ تو کھلی ہوئی بات ہے کہ تحریری زبان میں عوامی سرمایہ طبقاتی رنگ میں ڈوب جاتا ہے۔ بول چال کی زبان میں عوام کی زندگی کے گہرے اثرات ضرور ہوتے ہیں لیکن یہ ساری چیزیں طبقاتی روشنی میں اس وقت ڈھل جاتی ہیں جب بول چال کی زبان تحریری زبان بن جاتی ہے۔ تبت کی بول چال کی عوامی زبان بھی اس وقت طبقاتی رنگ میں نظر آنے لگی جب وہ تحریری زبان بن گئی۔ اس سلسلہ میں یہ بھی جان لینا ضروری ہے کہ یہ طبقاتی رنگ صرف رنگ ہی تک رہتا ہے۔ اس رنگ سے تحریری زبان طبقاتی صورت اختیار نہیں کر لیتی۔ زبان کی بنیادیں عوام کی زندگی میں نہایت ہی گہرائیوں میں ہوتی ہیں لیکن اس کے ارتقا اور اس کی تراش وخراش میں طبقاتی قوت بھی کام کرتی رہی ہے۔ عام کے ساتھ خاص لوگ بھی اپنا خون جگر دیتے رہتے ہیں۔ تبت کے ادیبوں نے بھی تبت کو ایک بار بہترین زمین کہا ہے۔ یہاں کے عوام کی ذہنیت ہمیشہ لیت سی رہی ہے۔ عوام کے معصوم شعور نے کبھی بھی اپنی تہذیب میں زندگی پیدا کرنے کے لئے نہیں سوچا۔ تبت کے لوگ اپنی حکومتوں سے ہمیشہ خوف کھاتے رہے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہمیشہ ظلم وستم کے شکار رہے اور ان پر

برابر سختی رہی۔ وہ اوہام پرستی کے بری طرح شکار رہے۔ ان میں جب بھی زندگی کے کچھ آثار نظر آئے۔ ان کی حکومتوں نے انہیں ختم کر دیا اور ان کی صلاحیتوں کو ابھرنے نہ دیا۔ تبت کے لوگ شروع سے بہت ہنس مکھ رہے ہیں۔ بات بات میں مزاح پیدا کرنا ان کا کام رہا ہے۔ وہ لوگ موسیقی اور رقص کے دیوانے سمجھے جاتے ہیں۔ کہانیاں سننے اور کہانیاں کہنے کا انہیں جنون سا ہے۔ بھینس، بھیڑ، یاک اور سور ان کی خاص غذا ہے۔ عورتیں اون سے کپڑے تیار کرتی ہیں۔ مردوں سے زیادہ عورتیں اوہام پرست ہیں تیوہاروں پر وہ قدیم سنسنی خیز کہانیاں سناتی ہیں۔ بھوتوں کی حرکتوں کو یاد کر کے بد حواس ہو جاتی ہیں۔ تبت میں عورتوں کی بہت عزت ہے۔ عورتیں اپنے ماحول کی وجہ سے نڈر اور بیباک نہیں ہیں۔ تبت کے لوگ اپنے دیوتاؤں کی تصویریں تراشنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ ان کی تراشی ہوئی تصویریں مندروں رہتی ہیں۔ ان کے مندر بھی بہت ہی خوبصورت ہوتے ہیں۔ جوگیوں اور سادھوؤں سے یہ لوگ ہمیشہ متاثر رہے ہیں۔ کبھی ان کا یقین تھا کہ جوگیوں اور سادھوؤں کے قبضے میں بھوت رہتے ہیں۔ چونکہ تبت پر سادھوؤں اور مہاتماؤں کی حکومت اکثر رہی ہے۔ اس لئے عوام کے دل میں ان کی محبت اور ان کا احترام بہت ہے۔ تبت کے عوام کے کردار میں جو نرمی اور اطمینان ہے وہ ان کی زبان میں بھی موجود ہے۔ ان کی زبان صاف ستھری نظر آتی ہے۔ مٹھاس اور گداز بھی ان کی زبان کی بڑی خصوصیت ہے

ہندوستان اور تبت کے تعلقات بہت قدیم ہیں۔ تبت کے لوگوں نے بدھ مذہب کو جس طرح قبول کیا اور ہندوستانی عناصر کو

اپنے یہاں جس طرح جگہ دی۔ اسکی تاریخ پوشیدہ نہیں ہے۔ بدھ
مذہب کو قبول کرنے کے بعد تبت کی ایک بڑی آبادی ہندوستان
کے بہت قریب آگئی۔ تبت اور ہندوستان کے گہرے تعلق کے سلسلہ میں
بہت ساری حکایتیں ہیں۔ ایک نہایت ہی دلچسپ حکایت یہ ہے کہ جب
ایک روز گوتم بدھ راجگیر (بہار) کے قریب کہیں بیٹھے اپنے خیالات کا
اظہار کر رہے تھے۔ تو انہیں قوس قزح کی ایک نہایت ہی خوبصورت اور
پیاری روشنی نظر آئی۔ ان کے سر سے شمال تک وہ روشنی چلی گئی تھی۔ روشنی
کو دیکھکر گوتم بدھ کے ہونٹوں پر ہنسی کی ایک لہر آگئی۔ ان کے خاص شاگردوں
نے مسکراہٹ کی وجہ دریافت کی تو گوتم بدھ نے جواب دیا۔ کہ ہندوستان کی
سرحد پر ایک زمین ہے۔ برف سے گھری ہوئی۔ وہاں کبھی بھی بدھ کا
گذر نہیں ہوا ہے۔ اس زمین پر خوشی کی کوئی بھی لہر نہیں گئی ہے۔ مصیبتوں
اور تکلیفوں میں وہاں کے لوگ جی رہے ہیں۔ بدھ مذہب کے ماننے والے
وہاں زندگی پھیلا سکتے ہیں۔ مصیبتوں کو مسرتوں میں بدل سکتے ہیں۔ گوتم
بدھ نے کہا کہ بہت جلد وہاں کے لوگ اپنی موجودہ زندگی بدل دیں گے
اور وہاں ایک نہایت خوشگوار فضا قائم ہو جائے گی۔ جس طرح موجودہ
بدھ مذہب کے ماننے والوں نے نروانا (Nirvana) حاصل کیا
ہے۔ اسی طرح اس زمین کے لوگ بھی نروانا حاصل کر لیں گے۔ تبت میں
انسان کی آبادی کس طرح پھیلی۔ اس کی دلچسپ داستانیں ہیں۔ تبت
میں انسان کے قبل بندروں کی آبادی کی ایک دلچسپ تاریخ بیان کی جاتی ہے
مہابھارت کی جنگ کے بعد یہ کہا جاتا ہے کہ تبت میں انسان آئے۔ روپتی
نام کے کسی راجہ کی شکست تبت میں ہوئی تھی۔ روپتی نے شکست کے بعد

عورت کی شکل اختیار کی اور پھر وہاں انسان کی آبادی پھیلی - اس وقت بھی اس قسم کی بہت ساری دلچسپ روایتیں اور حکایتیں بہت مشہور ہیں۔ تبت کے مشہور بادشاہ ناٹھی سانپو کے متعلق بھی ایک نہایت ہی دلچسپ کہانی بیان کی جاتی ہے۔ اس کا تعلق ہندوستان سے بتایا جاتا ہے - کہا جاتا ہے کہ سات سو برس بدھ کی پیدائش کے بعد ویشالی کے ایک راجہ کو ایک لڑکا پیدا ہوا۔ جس کی آنکھیں اور جس کے ہاتھ راجہ کو پسند نہ تھے - اس لئے اسے ایک دریا میں پھینکوا دیا گیا - وہ لڑکا بہت دور یا لنگ یا چین کے قریب آ گیا جہاں ایک بوڑھے کسان نے اسے اٹھا لیا - جب وہ لڑکا جوان ہوا تو کسان نے بتایا کہ وہ اسکا لڑکا نہیں ہے اس بات کا اثر لڑکے پر بہت ہوا اور وہ پہاڑوں اور جنگلوں میں گھومتا رہا۔ یاپ سینگ گومبا کے قریب آیا تو اس نے دیکھا کہ وہاں کے لوگ کسی کو اپنا راجہ بنانے کے سلسلہ میں جھگڑ رہے ہیں۔ بات نہیں بن رہی تھی جب لوگوں کی نگاہیں اس لڑکے پر پڑیں تو اسی کو راجہ بنا دیا۔ اس طرح وہ تبت کا پہلا راجہ ہوا۔ اسکا نام ناٹھی سانپو رکھا گیا۔ ناٹھی سانپو کی زبان وہاں کے لوگوں نے نہیں سمجھی۔ اس نے اشارہ سے بتا دیا کہ وہ ہمالہ کی طرف سے آیا ہے۔ تو لوگوں نے سمجھا۔ وہ آسمان سے آیا ہے

لہا - تھو تھو - ری بھی تبت کا ایک ایسا راجہ گزرا ہے جس کے متعلق بہت ساری حکایتیں مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے وقت میں ہندوستان سے پنڈت بدھی رکشیتا تبت آئے تھے۔ ان کے ساتھ بدھ مذہب کی بہت ساری کتابیں تھیں۔ چونکہ اس وقت تبت میں کوئی رسم الخط نہیں تھا اور لہا - تھو - تھو - ری بھی نہ کچھ سمجھ سکتا تھا اور نہ پڑھ سکتا تھا

اس لئے بدھی رکشتیا ہندوستان لوٹ گئے۔ سرونگ : سان ، گمپو (جس کا ذکر شروع میں کیا گیا ہے) بارہ برس کی عمر میں تخت پر بیٹھا ، لہاسہ میں اسنے اپنا دارالسلطنت رکھا۔ سرونگ نے نالندہ یونیورسٹی میں ایک سو سے زیادہ سمجھدار اور ذہین تبتیوں کو بھیجا تاکہ وہ ہندوستان میں رہ کر سنسکرت کی تعلیم حاصل کریں۔ اور پھر تبت کی زبان کو ایک رسم الخط ملے اور یہاں کی زبان میں بدھ مذہب کے خیالات اور اصول کے ترجمے ہو سکیں۔ ہندوستان کی گرمی ان میں سے بہت کم لوگوں نے برداشت کی۔ جو لوگ ہندوستان سے واپس آئے ان میں تھو، می، بودھ زینگ پو (Thonmi Bodh - Zang-Po) کا نام زیادہ اہم ہے۔ ہندوستان میں اس نے برہمن لی جن اور اچاریہ دیوادت سنہا سے تعلیم حاصل کی تھی۔ تبت آکر تھومی، بودھ زینگ پو نے کوشش کر کے اپنی زبان کو ایک رسم الخط دیا۔ یہی اس زبان کا پہلا رسم الخط سمجھا جاتا ہے۔ اس رسم الخط کی بنیاد سنسکرت پر تھی۔ بہت سارے وہ حروف جن کا تعلق تبت کی آواز نہیں تھا اس زبان میں نہیں رکھے گئے۔ تھومی، بودھ زینگ پو نے تبت کے ماحول کے مطابق رسم الخط کی تخلیق کی۔ یہ دوسری بات ہے کہ اسکی بنیاد میں ہندوستان کی زبان تھی۔ سرونگ، سان، گمپو نے ہندوستان کے بہت سارے علماؤں کو تبت آنے کی دعوت دی۔ پنڈت شیلا منجو پنڈت مکارا اور دوسرے پنڈتوں نے تبت کے لوگوں کی مدد سے سنسکرت کی بہت ساری کتابوں کا ترجمہ تبتی زبان میں کیا۔ سرونگ کے بعد بھی تبت اور ہندوستان کے تعلقات قائم رہے۔ ہندوستان سے لوگ آتے رہے۔ ترپھی۔ دی۔ سنگ۔ تان

نے بھی ہندوستان سے کچھ علماؤں کو بلا لیا۔ کامیلا گوشا اور گیان کمار اسی کے وقت میں تبت آئے تھے۔ ان دونوں نے اور بہت ساری کتابوں کے ترجمے کئے۔ پانچویں خاندان کے راجہ تری اسرونگ دی تانگ نے شنکر آچاریہ بودھی ستیا کو تبت بلایا۔ اچاریہ نے تبت میں بدھ مذہب کی اشاعت خوب کی ان کی زبان کا ترجمہ کشمیر کے ایک نوجوان اننتا نے کیا اور لوگوں تک ان کے خیالات پہونچائے۔ اننتا تبت کے عوام میں بہت مقبول تھا۔ اسکی زبان مقدس سمجھی جاتی تھی۔ اچاریہ بودھی ستیا کو اننتا سے کافی مدد ملی اور انہوں نے جی بھر کر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ تری۔سرونگ۔دی یلن نے بھی اچاریہ سے بہت کچھ سیکھنے کی کوشش کی۔ سات سو ستائیس برس قبل مسیح تبت میں ہندوستانی ڈھنگ کی کوئی یونیورسٹی قائم کی گئی۔ اندرہ یورسٹی کا رنگ و روپ اس یونیورسٹی میں آ گیا تھا۔ ہندوستان کے مشہور عالموں اور پنڈتوں کو اس یونیورسٹی کو دیکھنے کی دعوت دی گئی۔ وہاں سے کچھ لوگ آئے۔ ویمالا متر اور بدھا گپت کے علاوہ کچھ کشمیری پنڈت بھی آئے تھے۔ کشمیری پنڈت میں داناشیلا (جنہیں تبتی زبان میں کوئی اور نام دیا گیا تھا) اور جینا متر (جنہیں تبتی زبان میں گیال، دے، شیرگون کہتے ہیں) کے نام اہم ہیں۔ ان لوگوں نے تبتی عالموں کی مدد سے بہت ساری کتابوں کا ترجمہ کیا۔ جن تبتی عالموں نے ترجموں میں حصہ لیا۔ ان میں دو۔رن چن۔دی، مسا کیا۔لوگ، دو۔رن، پیگن کھا اور بھن، دی، نم، کھا کے نام مشہور ہیں۔ ان ادیبوں اور عالموں کا مطالعہ کافی وسیع تھا۔ سنسکرت زبان سے ان کی واقفیت بہت زیادہ تھی۔ ایک سو آٹھ جلدتا [illegible] کی کانگ پور کو اسی زمانہ میں مرتب کیا گیا تھا۔ بنگ، نفرما، کے تنذ رکومن

یہ ان ترجموں کا کام بند ہو گیا۔ ہندوستانی ادیبوں، پنڈتوں اور عالموں
کو تبت سے نکال دیا گیا۔ بدھ مذہب کی کتابوں کو جلایا گیا۔ بدھ مذہب
کے ماننے والوں کو لمبی قید کی سزائیں دیں۔ مہنتوں کی ساری دولت چھین
لی گئی۔ اور انھیں مفلس بنا کر بٹھا دیا گیا۔ گوتم کے مجسموں کو توڑا گیا اور جو
مجسمے ٹوٹ نہ سکے انہیں دفن کر دیا گیا۔ مندروں کے دروازے بند کر دئے
گئے۔ کچھ عجیب ہنگامے ہوئے۔ لنگ، دھرما کی ان حرکتوں سے تبت کے
لوگوں کی ذہنیت کو سخت چوٹ پہنچی۔ لوگوں نے اسکی حرکت زیادہ دنوں
تک برداشت نہیں کی اور اسے قتل کر دیا۔ اسکی موت کے بعد تبت کی حکومت
تقسیم ہو گئی۔ اس وقت موجودہ لداخ بھی تبت کا ایک حصہ تھا۔ لنگ
دھرما کے ایک لڑکے کی حکومت مغربی تبت پر تھی۔ اور دوسرے لڑکے کی
حکومت مشرقی تبت پر۔ بدھ ازم کا نام و نشان ایک طرح سے مٹ رہا
تھا۔ ایک سو برس تک اس مذہب میں تبت کی فضا میں زندگی نہیں آئی۔
جب تبت کے ایک حصہ پر ای۔ شی۔ یو کی حکومت تھی۔ اس وقت ایک
بار پھر ہندوستان اور تبت کے تعلقات گہرے ہو گئے۔ کشمیر کے لوگوں نے
بھی تبت کے حالات کو سمجھا اور جب تبت سے بہت سارے طلب کشمیر آئے
تو یہاں کے لوگوں نے بھی انہیں اپنا عزیز سمجھا۔ ہندوستان سے بہت سارے
پنڈت تبت گئے۔ انہوں نے تانترک، یوگ اچاریہ کے علم سے لوگوں کو
آگاہ کیا اور تبتی زبان میں بہت ساری کتابوں کا ترجمہ کیا۔ نالندہ یونیورسٹی
نے تبت کے عوام کی ذہنیت کو بہت زندگی دی ہے۔ تبت کے تمدن اور
تہذیب میں جان پیدا کی۔ اچاریہ دیپو، شیل بھدر، دھرم شالہ اور
چندر گومن کی کتابوں کے ترجمے تبت کی زبان میں ہوئے۔ شیل بھدر

آریہ دیو اور دھرم شالہ کی کتابوں کے ترجموں سے سنسکرت زبان کا تبت کی زبان پر اثر ہوا۔ آریہ دیو، چندر گومن کا زمانہ ایک نہیں تھا۔ آریہ دیو سشیل بھدر اور دھرم شالہ ہیون سنگ کے وقت میں تھے اور چندر گومن کا زمانہ آٹھویں صدی کا زمانہ ہے۔ نالندہ یونیورسٹی کے بہت سارے علماء جو تبت میں اسی مقصد کے لئے ہمیشہ رہ گئے ان میں پدما سا بھاوا کا نام ہمیشہ لیا گیا ہے۔ چین میں بھی نالندہ کے علماء اس مقصد کے لئے گئے تھے۔ ان لوگوں میں پارماتھا اور کمار جیوہ کے نام بہت مشہور ہیں۔ پارمتھا نے وسوبندھا کی زندگی کا حال لکھا۔ چینی زبان میں ترجمہ اپنی نوعیت کا پہلا ترجمہ تھا۔ دھرم دیو چین میں چالیس سال تھے۔ انہوں نے قریب قریب ایک سو اٹھارہ بدھ مذہب کی کتابوں کا چینی میں ترجمہ کیا تھا۔ غرض نالندہ یونیورسٹی کے اثرات بھی بدھ مذہب کے ساتھ ساتھ چین اور تبت کے عوام پر ہمیشہ پڑتے رہے ہیں۔

تبت کی خاص آوازیں یہ ہیں:-

کَ

سَ

گَ

کھَ

تھسَ

نَ

ٹ

ٹُو

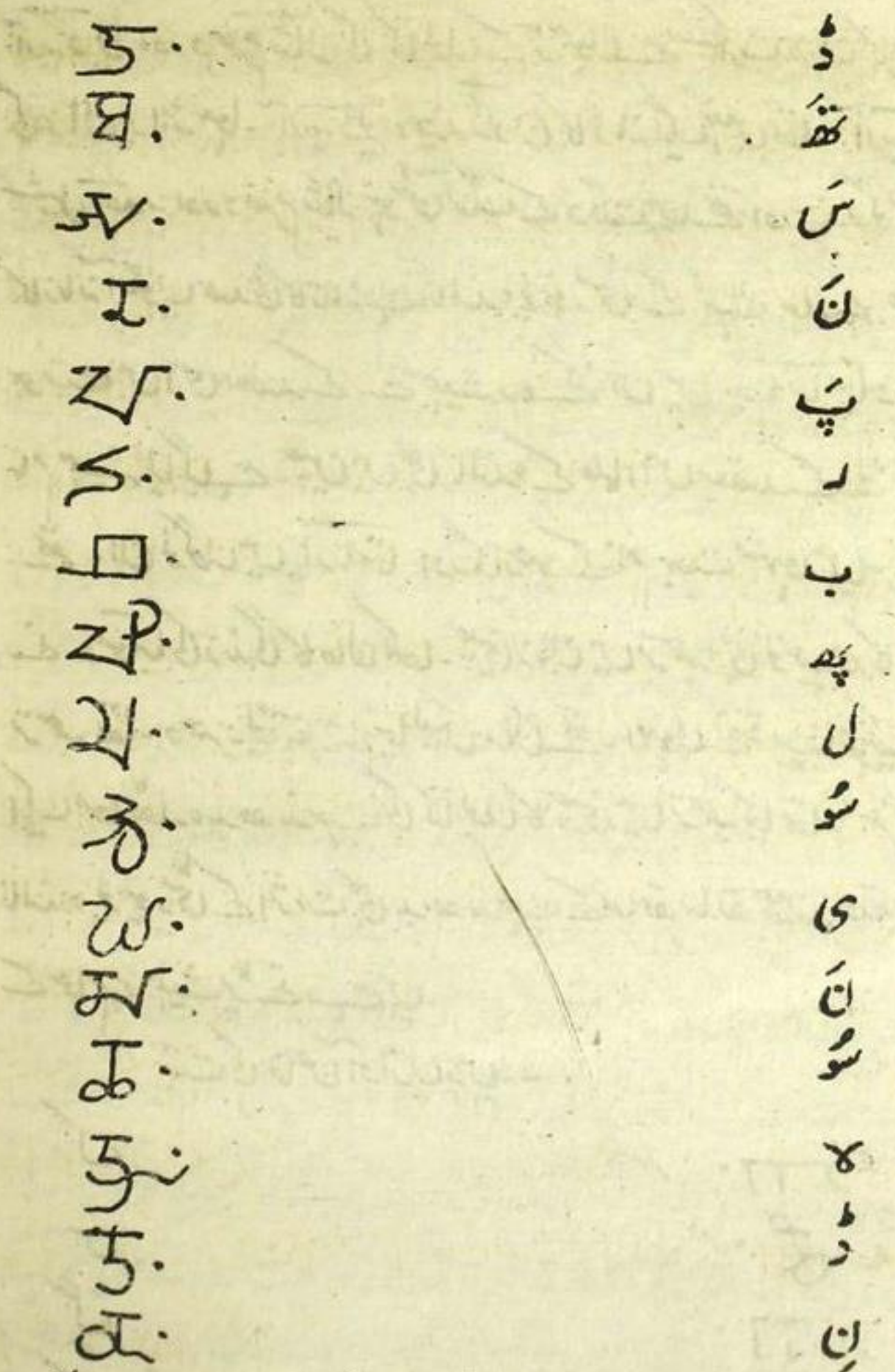

ڈ

ٹھَ

سَ

نَ

پَ

ر

ب

پھ

ل

سُو

ی

اَ

سُو

ہ

ڈ

اِن

قدیم ہند چینی زبان میں "ح" اور "ہ" کو اس حیثیت سے لوگ نہیں جانتے تھے کہ ان سے الفاظ بھی بنائے جا سکتے ہیں۔ قدیم بتت میں "ح" اور "ہ" کی ابتدا صوتی بھی ہوئی ہے۔ ح۔ باپیا (چھپانا) ح۔ کھاہونا (آنا) اور اس قسم کے دوسرے الفاظ شروع میں بتت میں نہیں تھے آج بھی وہاں کے لوگ "ح" کو کم اہمیت دیتے ہیں۔ آج بھی

"ڈ۔ گا" اور "م۔ ناہ" کو "ڈاگ" ([illegible]) اور "مان" ([illegible]) کہتے ہیں۔ اور "ح۔ بائبپا" کو "ابپا" (بمعنی چھپانا) کہتے ہیں اور "ح کھیوبنا" کو "یوبنا" اور ح کھومیا" کو "یومیا" کہتے ہیں۔ تبتی زبان میں "با، گا، ڈا، جیسے الفاظ زور دینے کے لئے لائے جاتے ہیں۔ مثلاً

ک، بریا	اٹھ جانا
ک، پورلبا	اڑانا
ب، ڈگیا	قبضہ کرلینا
گ، ہگیا	توڑلینا

تبت کی زبان میں "م" جسم کے خاص حصوں کی طرف اشارہ کرنے کے لئے لاتے ہیں۔ مثلاً

م۔ گل	زبان۔ گردن
م۔ نل	عورت کا رحم
م۔ تھل	خون
م۔ ڈانس	سامنے کا سر

"م" سے انسان کی عظمت اور قابلیت کیطرف بھی اشارے کرتے ہیں:-

م۔ کھسیا	پڑھا۔ لکھا۔ قابل
م۔ گرن پو	بنا مہمان
م۔ گوپو	استاد یا مالک

سنہ ۲۰۰ء کے قبل جاپان میں تحریری زبان کا کوئی نشان نہیں ملتا ہے۔ چینی کتابیں بھی سنہ ۴۰۰ء کے بعد آئی ہیں۔ چھٹی صدی میں جب بدھ

ازم آہستہ آہستہ پھیلنے لگی تو چینی عوام کے خیالات بھی پھیلنے لگے۔ چینی کتابیں جاپان کے لوگوں میں زیادہ مقبول ہونے لگیں۔ ایسے وقت میں چینی زبان کی اہمیت زیادہ ہو گئی اور جاپانی اپنی زبان کو بہت نیچی سطح پر لا کر دیکھنے لگے۔ چینی زبان سے اس قدر قریب ہونے کی وجہ سے چینی زبان کی بہت ساری کہانیاں بہت سی چھوٹی چھوٹی نظمیں، بہت سے لطیفے اور بہت سی کتابیں اور ان کے اشارے جاپانی عوام کی اپنی چیزیں بن گئیں۔ لفظ جاپان بھی چینی زبان کی دین ہے۔ چینی لفظ جیہہ پن (Jih - Pen) ہے جس کے معنی ہیں آفتاب کا وجود یا ابتدا یعنی وہ جگہ جہاں سے آفتاب طلوع ہوتا ہے۔ جاپانی نام "نی ہون" (nihon) بھی بتایا جاتا ہے*۔ اب تک جو تحقیق ہو چکی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ جاپان میں جو پہلی بار چینی کتابیں لائی گئی تھیں۔ ان میں (Thousand character classics)

اور (Confucian Analects) بھی تھیں۔ شروع میں ظاہر ہے جاپان کے اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی چینی زبان کا تلفظ صحیح نہیں کر سکے ہوں گے۔ وہ جس طرح سمجھتے ہونگے اسی طرح پڑھتے ہونگے وہ چینی اشاروں کو بھی جاپانی میں ٹھیک طور پر نہیں سمجھتے ہونگے اور ذہن میں بیشمار چینی الفاظ کے معنی کو رکھنا بھی دشوار ہوگا۔ ایک ایک لفظ کا مطلب سمجھنا ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا۔ جملوں کا مطلب سمجھ جانا ہی بڑی بات تھی۔ سینکڑوں چینی اور سنسکرت اشارے ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ سکے اور ان لوگوں کی ساری کوششیں اس سلسلے میں رائگاں گئیں۔ سینکڑوں مواقع ایسے آئے کہ یہ لوگ صرف ادھورے جملے بنا کر رہ گئے

* جدید نام نپون (Nippon) ہی زیادہ رائج ہے

کوئی ایک سنسکرت لفظ ایک یا ایک سے زیادہ چینی کردار کی نمائندگی نہیں کرتا تھا۔ بلکہ یہی چینی کردار ایک یا ایک سے زیادہ سنسکرت الفاظ کی نمائندگی کرتا تھا۔ جیولین نے ایک مثال دی ہے جو دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔

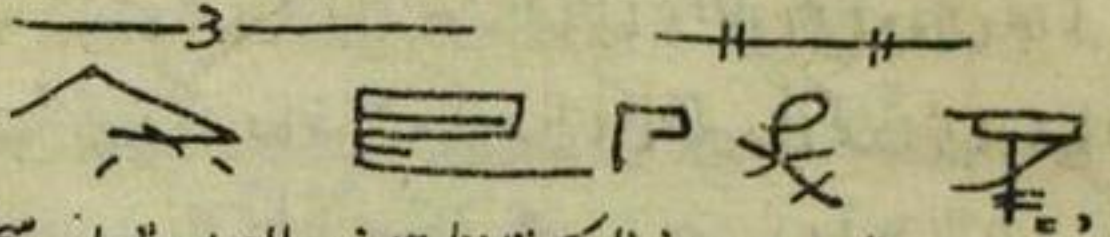

مندرجہ بالا سارے الفاظ کے تلفظ چینی زبان میں "چا"، "چ" "چی" ہے اور یہ سارے الفاظ سنسکرت کے ایک لفظ "ڈا"   کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اسی طرح چینی کردار (جی)   سنسکرت کے الفاظ "جھا" "ڈھا"، "ڈیا"، "ڈھیا" اور "چا" کی نمائندگی کرتا ہے

ان باتوں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جاپانی اپنی تحریر کو ہر لحجہ زندگی نہیں دے سکتے ہیں۔ وہ زندگی جس کی ضرورت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جاپانی تحریر کے آہستہ آہستہ اور بہت ہی مدھم روشنی میں آگے بڑھی ہے آٹھویں صدی میں جب حکومت کا سارا کام "نارا" میں ہوتا تھا۔ اس وقت چینی زبان ہی جاپان کے لئے سب کچھ تھی۔ جاپانی کا نام ونشان نہیں تھا۔ اس وقت کی لکھی ہوئی چیزیں جو آج دستیاب ہوئی ہیں۔ وہ سب چینی زبان میں لکھی ہوئی ہیں۔ چینی زبان کا اثر نہایت ہی گہرا تھا ماہرین لسانیات نے اس وقت کی تحریروں کا اب تک جو کچھ پتہ چلا ہے اس میں صرف دو تین درجن جاپانی الفاظ نظر آتے ہیں۔ باقی سارے الفاظ اور سارے جملے چینی ہیں۔ حال ہی میں نارا تہذیب (Nasa) (civilization) کی ایک یادگار دریافت ہوئی ہے۔ یہ ایک

پتھر ہے - جس پر جاپانی زبان میں کچھ لکھا ہوا ہے - اسے "بسوکوسیکی" (Bussokuscki) کہتے ہیں - یعنی گوتم بدھ کے پاؤں کا نشان اس پتھر پر البتہ چینی زبان کا کوئی لفظ نظر نہیں آتا ہے - نارا دور کی جو کچھ خاص چیزیں دریافت ہوئی ہیں - ان میں قدیم باتوں کا ایک ریکارڈ - سنہ ۷۱۲ء میں تیار کیا گیا تھا - اس میں جو نظمیں ہیں وہ اس لحاظ سے بھی بہت قیمتی ہیں کہ وہ سنہ [illegible]ء کی زبان کی نمائندگی کرتی ہیں - دریافت کی ہوئی چیزوں میں ایک نظموں کا انتخاب بھی ہے جسے جاپانی میں "نی ہونگی" (Nihongi) کہتے ہیں - یہ انتخاب غالباً سنہ ۷۲۰ء میں ہوا تھا - اس کی بعض نظمیں بہت ہی قیمتی سمجھی جاتی ہیں - "شوکونی ہونگی" (shoku-nihongi) جس کا انتخاب سنہ ۷۹۷ء میں ہوا تھا - اس میں خالص جاپانی زبان کا استعمال ہے - انگشکی (Engishiki) کی بھی ایک جلد پائی گئی ہے - جس میں عبادت کے طریقے بتائے گئے ہیں اور روحانی مسرتوں کو حاصل کرنے کا راز سمجھایا گیا ہے - ان کے علاوہ مختلف خاندانوں کی ترتیب دی ہوئی مختلف کہانیاں بھی ہیں اور نویں صدی کے شروع کی مرتب کی ہوئی ایک کتاب ہے - جسے جاپانی میں "مان یوشو" (Manjoshu) کہتے ہیں - اس میں نظمیں اور گیت ہیں بعض نظمیں اور گیت بہت پرانے ہیں - کچھ نظمیں اور گیت ساتویں صدی کے بھی ہیں -

جاپانی زبان کے نارا دور کے بعد جو دور آیا - اسے "ہی یان دور" (Heian Period) کہتے ہیں - چونکہ اس وقت حکومت کا سارا کام ہی یا نو (جسے آجکل کیوٹو (Kyoto) کہتے ہیں) میں ہوتا تھا - اس لئے جاپانی کے اس دور کو ہی یان دور کہا جاتا ہے - کوکنشو (Kokinshu) اسی دور کی یادگار ہے - اس میں منتخب بہترین گیت اور نظمیں شامل ہیں - "توسونکی"

(Makurandsohi) اور ماکورانو خوشی" (Tosa NiKKi)
جیسے تاریخی کارنامے اسی دور کی یادگار ہیں۔ "تن رای جبتورو کو" اس وقت
کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اس میں تاریخی حقیقتوں کو صاف طریقہ سے پیش کیا
گیا ہے۔ کہیں گنجلک باتیں نہیں ہیں۔

"ہی یان دور" کے بعد جاپانی زبان کے تیسرے دور کو کاما کورا
دور (Kama-Kora Period) کہتے ہیں۔ اس دور کا زمانہ
۱۱۸۲ء سے ۱۳۳۲ء تک ہے۔ اس وقت ملک پر فوجی حکومت تھی۔ اس
دور کی بھی تحریروں کا پتہ اچھی طرح نہیں چل سکا ہے۔ جب حکومت کیوٹو میں
تھی۔ اس وقت قدیم تمدن کا گہوارہ بھی کیتو بن چکا تھا۔ عوام قدیم تمدن کے
متعلق بہت کچھ جاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ حکومت کو اسکی خبر نہیں تھی
کہ ملک کے دوسرے گوشوں میں فوجی طاقتیں اپنی علیحدہ زمین تیار کر رہی تھیں
ان گوشوں کے عوام بھی اس جدوجہد میں مصروف تھے۔ اگر یہ بات نہیں ہوتی تو
جنگ کی کہانیاں عوام کے دل کی دھڑکنوں کو نہیں کر نہیں آتیں۔ زبان میں رکھے
بن کے ذمہ دار بھی عوام ہی ہیں۔ اس وقت کی زبان پر "کیبتو" کی زبان و ادب
اور عوام کے حالات کا گہرا اثر ہے۔ اس وقت جاپانی کو ایک نیا اسلوب
اور نئی تکنیک بھی دی جا رہی تھی۔ جنگی کہانیوں کی اس دور میں زیادہ تخلیق
ہوئی۔ یہ کہانیاں طویل نہیں ہوتی تھیں۔ نہایت ہی مختصر اور بہت ہلکی پھلکی
کہانیاں ہوتی تھیں۔ بعض تو بہت اچھے لطیفے بھی ہیں۔ ان کہانیوں اور
لطیفوں کا پس منظر جنگ ہے اور اس کے کردار میں عوام کی زندگی ہے معمولی
لوگ ان حکایتوں میں جو بڑے بڑے کام کر جاتے ہیں وہ فوجی افسروں کی
بس کی بات نظر نہیں آتی۔ فوجی افسروں کے کردار نہایت ہی ہلکے ہیں۔ وہ
کہانیوں کو سہارا ضرور دیتے ہیں لیکن ان سے کہانیاں آگے نہیں بڑھتی ہیں۔

اس کا ثبوت نہیں ملتا ہے کہ جاپان میں کوریا کے لکھنے والوں کے قبل کوئی کتاب یا کوئی ریکارڈ موجود تھا۔ یا نہیں۔ جاپان میں کوریا کے لکھنے والے سنہ ۴۰ء کے کچھ قبل ہی آئے تھے۔ کوریا کا مشہور ادیب "وانگ ان" کی آمد کے قبل جاپان میں کوئی تحریری نشان نہیں ملتا۔ "نہونگی" میں یہ بات صاف طور پر نمایاں ہے کہ وانگ ان اور دوسرے پڑھے لکھے انسان جو کوریا سے آئے تھے۔ ان لوگوں نے شروع شروع میں چینی زبان میں لکھنا شروع کیا۔ ان لوگوں کے بعد بھی حکومت کے سارے کام عرصہ تک چینی زبان میں ہوتے رہے۔ وانگ ان اور ان کے ساتھیوں نے کوریا میں بھی چینی زبان کی ابتدا کی تھی۔ کوریا کا سارا کام چینی زبان میں ہوتا تھا لیکن کوریا کے خاص نام کے لئے (آدمی اور جگہ کے نام) کوریا کے وہ الفاظ لائے جاتے تھے جنہیں عوام زیادہ سمجھتے تھے۔ وانگ ان نے اس کی کوشش جاپانی میں بھی کی۔ اور کامیاب رہا۔ وانگ ان اور اس کے ساتھی چینی کردار سے اچھی طرح واقف تھے۔ اسلئے انہیں جاپانی میں بہت جلد کامیابی نصیب ہوئی۔ کوریا کے یہ قابل قدر انسان چین کے الفاظ کی صوتی خصوصیت سے اچھی طرح واقف تھے۔ اور انہیں جاپان کے خاص نام کی اہمیت کا بھی اچھی طرح احساس تھا۔ یہی وجہ ہوئی کہ جب سب کچھ چینی زبان میں لکھا گیا تو جاپان کے آدمی اور جگہوں کے نام جاپانی میں لکھے جانے لگے۔ وانگ ان اور اس کے ساتھیوں کا یہ ایک بڑا کارنامہ ہے

یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ پانچویں صدی کے اخیر تک جاپان کے عوام چینی کردار کو جاپانی الفاظ کے صوتی اشارے بنانے کے طریقے اور استعمال جان گئے تھے۔ کیوجکی جاپان کی سب سے پہلی جاپانی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ کیوجکی (Kyuji ki) سنہ ۶۲۰ء میں مرتب کی گئی تھی لیکن

سنہ ۶۴۵ء میں کتاب ضائع ہو گئی۔ اسکا کوئی پتہ نہیں چلتا کہ اس کتاب میں کیا خاص باتیں تھیں۔ "تی۔ ہونگی" سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ "کی۔ یوجیکی (Kyujiki) شہنشاہوں اور مقبول گھرانوں کی تاریخ تھی۔ اسکا پتہ نہیں چلتا کہ اس کتاب میں عوام کے رہن سہن، جینے کے طریقے اور ان کی جد و جہد کا کوئی نشان ملتا تھا یا نہیں۔ "ہنوہونگی" میں بھی اس کے متعلق کچھ پتہ نہیں چلتا "نیوہونگی" میں اس کتاب کے متعلق جو بیان ہے وہ تشفی بخش نہیں ہے۔ اس کے بعد جو سب سے پرانی جاپانی کتاب کا پتہ چلتا ہے وہ "کوجی کی" ہے۔ اس میں قدیم باتوں کو جمع کیا گیا ہے۔ یہ کتاب سنہ ۷۱۲ء میں تیار ہوئی تھی۔ یہ جاپان کی پہلی تاریخ ہے۔ جس میں جنت کی تخلیق اور زمین کی تخلیق کے متعلق باتیں کی گئی ہیں جہاں زمین کی تخلیق کے متعلق باتیں ہیں۔ وہاں یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ اسکی تخلیق میں جہاں خدا کا ہاتھ رہا ہے وہاں، انسانوں کی منظم جماعت بھی کام کرتی رہی ہے۔ اس کتاب کی زبان کوئی خاص تحریری زبان نہیں ہے بلکہ وہی ہے جو اس وقت کے لوگ بولتے تھے۔ جاپانی زبان کی خاص آوازیں یہ ہیں:

آ	ア
کا	カ
سا	サ
تا	タ
نا	ナ
ھا	ハ
ما	マ
یا	ヤ

را

وا

آٹی

کی

سی

تی

نی

ہی

سی

ری

وی

یو

کیو

سُو

نو

لو

ہو

مو

یو

او

ای

کی
سی
تی
نی
ہی
انی
ری
ثی
او
کو
سو
تو
نو
ہو
سو
پو
رو
او

قدیم جاپان کی تاریخ کا علم ہمیں بہت کم ہے۔ روایتوں، حکایتوں اور قدیم مذہبی نظموں اور گیتوں سے ہمیں تھوڑی بہت باتیں معلوم ہوتی ہیں ان روایتوں اور حکایتوں میں بہت ساری باتیں ایسی ہیں جن پر یقین نہیں

کیا جا سکتا۔ ایک نہایت ہی قدیم دستاویز سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم جاپانی جاپان کو جنت سے بہت قریب سمجھتے تھے اور مختلف قسم کے دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے۔ یاماٹو کلچر سے بھی قدیم جاپان کو بہت کچھ سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس وقت شہر نہیں بسائے جاتے تھے بڑے مکان بنانے کے طریقے لوگوں کو معلوم نہیں تھے۔ کاشتکاری کی زندگی کے بعد فوجی زندگی کی اہمیت زیادہ تھی۔ بہت سارے طبقے تھے غلامی عام تھی۔ بنے بنائے قانون نہیں تھے۔ وقت اور حالات کے مطابق قانون بنائے جاتے تھے۔ قدیم جاپانی ایک ایک انچ زمین کے لئے لڑتے تھے۔ اس طرح جنگ کا ماحول ہر وقت تیار رہتا تھا۔ مغرب اور دکن کی ریاستوں سے ان کی لڑائیاں ہمیشہ رہیں۔ جنگ کی ابتدا بادشاہ کی مرضی سے ہوتی تھی۔ اور جنگ کا خاتمہ بھی بادشاہ کی خواہش پر ہوتا تھا۔ بادشاہ ہی جنگ اور امن کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ جاپانی عوام کو بادشاہوں کی ہر حرکت پر ہمیشہ اعتماد رہا ہے۔ یاماٹو کلچر میں کوئی جان نہیں تھی۔ اس کے برعکس چین کے کلچر میں ہر طرف زندگی ہی زندگی تھی۔ دو سو قبل مسیح چینیوں کے پاس ان کا ادب تھا۔ آرٹ تھا، فلسفہ تھا۔ ان کی زبان اور ان کی تحریر نے بھی کافی ترقی کر لی تھی۔ جاپان پر چینی کلچر کا اثر ہوا۔ ہان خاندان کے زمانہ میں چین اور جاپان کے تعلقات زیادہ گہرے ہوئے۔ چینیوں نے کوریا کے ساتھ ساتھ جاپان کے کلچر پر بھی اپنے اثرات چھوڑے۔ یاماٹو کلچر پر تو خاص طور پر اثر ہوا۔ رفتہ رفتہ کنفیوشیس کے نظریئے جاپان میں پھیلے۔ چینی تحریروں نے جاپانی زندگی میں ایک خاص جگہ حاصل کر لی۔ جاپان کے سیاح اور سفیر چین آئے اور وہاں کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا

جاپان اور چین کے تعلقات بہت گہرے ہو گئے۔ چینی زبان اور ادب کی اہمیت جاپان میں زیادہ ہوئی۔ چینی تحریر کا سارا حسن جاپانی زبان میں نہیں آیا لیکن اس سے کافی فائدہ حاصل کیا گیا۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ چینی زبان کی وجہ سے بہت سارے الفاظ جاپانی میں شامل ہوئے۔ جاپانیوں نے اسکی کوشش کی کہ وہ اپنے لہجہ کی مناسبت اور آواز کے مطابق چینی الفاظ حاصل کریں۔ چینی آرٹ، فلسفہ، ادب، مذہب سبھوں نے جاپانی زندگی کو گہرے طور پر متاثر کیا۔

وسط ایشیا چودھویں صدی عیسوی میں تہذیب و تمدن کا ایک مرکز سمجھا جاتا تھا۔ تاجکستان، ازبکستان، کازکستان اور ترکمانستان کے علاقے روشن تھے۔ رودکی، فردوسی، بوعلی سینا، طوسی اور البرونی اور دوسری عظیم شخصیتیں بھی وسط ایشیا سے اپنا گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ حافظ، عمر خیام اور شیخ سعدی کو بھی سمرقند اور بخارا کی پاکیزگی اور صباحت عزیز تھی۔ وسط ایشیا نے علم و فن کے سینکڑوں چراغ جلائے اور ان چراغوں سے دوسرے بہت سارے چراغ روشن ہوئے۔ خیالات کی سانسوں میں خوشبو پیدا ہوئی۔ جذبات کے زیر و بم میں آہیں پیدا ہوئیں تصورات نے سینکڑوں مجسموں میں روح ڈال دئے۔ تہذیب کی چاندی میں عجیب نرمی پیدا ہو گئی۔ سمرقند، بخارا اور خراسان میں ثقافتی ترقی اپنی ایک خاص منزل پر پہنچ چکی تھی۔

زار شاہی روس کی تاریکیاں جب ان علاقوں میں پھیل گئیں تو ان علاقوں کا کلچر تباہ ہونے لگا۔ یہاں طبقے قائم ہو گئے۔ مختلف حکومتیں وجود میں آگئیں۔ چھوٹی چھوٹی حکومتوں کے قائم ہو جانے سے

سے بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ ان علاقوں کی قوموں کی نفسیات بدل گئی۔ اقتصادی حالت خراب ہوگئی۔ اخلاقی زوال پیدا ہوگیا۔ اس زار شاہی حرکت کو دیکھکر لینن نے زارازم کے متعلق کہا تھا کہ زار ازم شہنشاہیت کی سب سے خراب صورت ہے۔ ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے وقت ان حکومتوں کے عوام انتہائی پستیوں میں چلے گئے تھے۔ ان کی معاشی اور اخلاقی حالت ابتر ہوچکی تھی۔ ان کی نفسیات کی ساری خوبصورت باریکیاں ٹوٹ چکی تھیں یا تحت الشعور میں پناہ گزین تھیں اور ان کی نفسیات کی ساری گندگیاں اپنے ماحول کے اثرات کے ساتھ اس طرح سامنے آگئی تھیں۔ بغیر ان میں لت پت ہوئے یہاں کے لوگوں کا زندگی بسر کرنا مشکل تھا۔ جہالت ان کی زندگی تھی۔ جہالت ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ عیسائی مشنریوں کے پروپیگنڈہ رسالوں کو پڑھنے کی اجازت تھی اس کے علاوہ تعلیم حاصل کرنے کے لئے کوئی ادارہ نہیں تھا۔ اس طرح ذہنی آزادی اور سوچنے پر بھی ایک قسم کی پابندی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انقلاب کے بعد چالیس قومیں ایسی ابھر آئیں جن کی تحریری زبان کا کوئی پتہ نہیں ہے۔ ۱۹۳۱ء میں لینن نے کہا تھا کہ روس کے جاگیردارانہ نظام نے اسی فی صدی لوگوں کو جہالت کے بے پناہ سمندر میں ڈال دیا ہے تعلیم میں بھی طبقاتی مفاد ہی سب کچھ سمجھا جاتا تھا۔ تعلیم حاصل کرنے کی اجازت سارے لوگوں کو نہیں تھی۔ تعلیم ایک خاص طبقہ کی میراث بن گئی تھی۔ خانساماؤں، باورچیوں، دفتر میں معمولی کام کرنے والوں اور چھوٹے چھوٹے دکانداروں اور معمولی تجارت کرنیوالوں کے بچے اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کرسکتے تھے۔ اس سلسلہ میں حکومت کی

کی طرف سے فرمان جاری ہوا کرتے تھے۔ ان کے بچوں کے لئے ترقی کے سارے راستے بند تھے۔ تعلیمی اداروں میں قدم نہ رکھنے کی ممانعت تھی۔ ۱۸۲۸ء میں، ایسے قانون بنے جن سے کسانوں اور غریب مزدوروں کے بچے گاؤں سے باہر تعلیم کے لئے نہیں جا سکتے تھے۔ گاؤں میں جو تعلیم تھی وہ کچھ بھی نہ تھی۔ عیسائی پادری اس طرف کبھی کبھی آجاتے تھے وہ اپنے خیالات اور نظریے کا پرچار کرتے تھے لیکن یہ بھی مضحکہ خیز بات تھی۔ کہ ان عیسائی پادریوں کی باتوں کو سمجھنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ ان کی زبان بھی بچوں کی سمجھ سے باہر تھی۔ زارشاہی حکومت نے عوام کو روسی زبان سے اور ان کی اپنی دوسری مادری زبانوں سے دور رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ روس کے اونچے طبقہ میں فرانسیسی زبان بولی جاتی تھی۔ روسی زبان گنواروں کی زبان سمجھی جاتی تھی۔ پھر روسی زبان پر ہر جگہ پابندیاں تھیں اور اس زبان میں ترقی کے ہر راستہ کو بند کر دیا جاتا تھا۔ کہ زبان میں پاکیزگی نہ آئے اور سادگی اس سے دور رہے عوام ایک دوسرے کو زیادہ سے زیادہ نہیں سمجھ سکیں۔ حکومت کے مظالم عیاں ہو کر سامنے نہ آجائیں اور کوئی اچھا ادب پیدا نہ ہو۔ زارشاہی حکومت کی اسکی ہر ممکن کوشش رہی کہ عوام اپنی زبان سے اپنے ماضی اور اپنے حال کے واقعات کو کہانیوں یا منظوم افسانوں کی شکل میں نہ رکھ دیں۔ اسلئے کہ یہی ماضی اور حال کے واقعات ان کے شعور میں کسمساہٹیں پیدا کرتے اس طرح زارشاہی حکومت عوام کی تاریخ مٹانا چاہتی تھی۔ اور عوام کی نفسیات کو ایک دوسری صورت میں دیکھنا چاہتی تھی۔ اونچے طبقہ کے ادیب بھی حد درجہ تنگ نظر تھے۔ انہیں زبان کے کردار کی اہمیت کا

کوئی پتہ نہیں تھا۔ وہ زبان کی انفرادیت کو سمجھنے سے مجبور تھے۔۔ یہی
وجہ تھی کہ وہ روسی زبان میں اپنے جذبات کا اظہار کرنا توہین سمجھتے
تھے۔ یہ ادیب ہمیشہ نیچے طبقہ کا مذاق اڑاتے تھے۔ اور اپنے خاص
طبقہ کی نفاست اور اداؤں کی تصویر کشی کرتے تھے۔ ان ادیبوں کی
وجہ سے فرانس کی ادائیں اور نفاستیں، نزاکتیں اور دلربائیاں سب
کچھ ادب میں آگئیں۔ لیکن فرانس کے انقلاب کی کوئی حرکت قریب نہیں
آئی۔ وہ ادیب جو حقیقت کو سمجھ رہے تھے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ
ادب کے ذریعہ فرانسیسی انقلاب کی حقیقتوں کو عیاں کیا جائے اور
عوام کے شعور پر ان حقیقتوں کا زیادہ اچھا اثر پڑے۔ اس طرح درباری
ادائیں ختم ہو جائیں گی اور روسی زبان کی قدر بڑھ جائیگی۔ زارشاہی نے
حکومت نے جمہوریت پسند ادیبوں کو مختلف قسم کی سزائیں بھی دیں اور
بہت زیادہ پریشان بھی کیا ——— وسط ایشیاء کے چھوٹے چھوٹے
علاقوں میں چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم ہو گئیں، جو صرف نمائشی حکومتیں
تھیں۔ وسط ایشیاء کے عوام کی زبان اور ان کے کلچر کو تباہ کرنے کی
ہر ممکن کوشش کی گئی۔ تحریری زبانیں آہستہ آہستہ مٹتی گئیں۔ زارشاہی
روس نے علم کی دنیا کے جتنے چراغ بجھائے ہیں۔ اسکی مثال دنیا کی تاریخ
میں بہت کم ملیگی۔ لیکن عوام کے کلچر کو مٹا دینا بھی ناممکن ہی ہوتا ہے
ایسے وقت میں بھی جب کہ کلچر کی روایات کو ختم کرنے کی سازش اچھی طرح
کامیاب نظر آرہی تھی۔ ان علاقوں کے عوام نے اپنی روایات کو سینوں سے
لگائے رکھا۔ ان روایات کی جڑیں نہایت ہی گہرائیوں میں تھیں۔ اس لئے
ان کا مٹانا آسان نہیں تھا۔ ان علاقوں میں ایسے شعرا پیدا ہوئے

جو بالکل ان پڑھ تھے۔ ان کی کوئی تحریری زبان بھی نہیں تھی۔ یہ شعرا ہر جگہ جاتے اور اپنے گیت اور نظمیں سناتے تھے۔ ان گیتوں اور نظموں میں ان کی تاریخ ہوتی تھی۔ ان کے ماضی کے خوبصورت نقوش ہوتے تھے ان کے لوک گیتوں اور ننھی ننھی کہانیوں میں ان کی بہادری اور شجاعت کی داستانیں ہوتی تھیں۔ کلاسکی، فارسی شاعری چونکہ ان کے شعور کو اچھی طرح متاثر کر چکی تھی۔ اس لئے فارسی زبان ایک ایسا سلسلہ بن گئی تھی جس کی مدد سے یہ شعرا ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے اور مختلف زبان بولنے والوں کو بھی اسکی مدد سے قریب کیا۔ علاقائی زبان اور مقامی زبان کی تعلیم کی مخالفت تھی۔ زبردستی روسی زبان ان کے سامنے کھڑی رہتی تھی۔ اس لئے یہ مختلف قومیں اندر بھی ایک دوسرے سے دور ہوتی گئیں۔ ان شاعروں نے فارسی کا سہارا لیکر اور اپنی زبان میں مختلف مقامی زبانوں کے عناصر کو شامل کر کے ہر علاقہ کے لوگوں کو اپنے قریب لائے اور انہیں اپنی تاریخ سنائی، اپنے ماضی کے خوبصورت عناصر کا مظاہرہ کیا۔ شجاعت اور ہمت کی داستانیں سنائیں۔ تاریخ کے اہم کرداروں کی تصویریں پیش کیں۔ کہانیوں سے کہانیاں بنتی گئیں اور گیتوں اور نظموں سے دوسرے گیت اور دوسری نظموں کی تخلیق ہوتی گئی۔ اسطرح ان شاعروں کی وجہ سے کلچر کی روایات کی بہت کچھ حفاظت ہو سکی اور عوام شعوری اور غیر شعوری طور پر اپنے کلچر کی روایات کو محفوظ رکھنے کی جدوجہد کرتے رہے۔ ان شاعروں نے نئے کردار بھی پیش کئے جن کرداروں کا اثر روسی ادیبوں پر بھی زبردست ہوا۔ طالسطائی کے کرداروں میں بھی ان "جاہل" شاعروں کے تراشے ہوئے کرداروں کے

نقوش نمایاں ہیں۔ قزاق کے شاعر جمول زاہر، ترکمانیہ کے شاعر دردی ترگنیا کے سلیمان اور نقبازنے وسط ایشیا کے عوام کو جھنجھوڑ کر رکھدیا ان لوگوں نے آزادی کی آوازیں بلند کیں۔ جمہوریت کا نعرہ بلند کیا۔ زار شاہی حکومت پر طنز کے تیر چلائے۔ ایسا مزاح پیدا کیا۔ جس میں طنز کے زبردست نشتر تھے۔ ماضی کی شجاعت کو عیاں کیا۔ مختلف قسم کے ایسے کردار تراشے جن سے زندگی میں جدوجہد کرنے کی لگن پیدا ہوئی ان کہانیوں کو لوگوں نے دلوں میں اتارا۔ ان کے لوک گیتوں کو بچوں نے اپنی زبان پر ہمیشہ رکھا۔ دراصل یہی وہ فنکار تھے جو زار شاہی حکومت کی بنیاد توڑنے کی پہلی کوشش کر رہے تھے۔ اور عوام میں زندگی لانے کی تمنا میں جی رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ گمنام شاعر انقلاب کے بعد بالکل سامنے آگئے۔ اور ان کی تخلیقات کے ترجمے مختلف زبانوں میں ہوئے۔ جمبول زاہر، دردی قلیچ سلیمان، اور نقباز کے علاوہ بردہ بابا تیف، شیخ زادہ، غفور غلام، صدرالدین عینی اور نصرت علی سعدوف وغیرہ کی تخلیقات بھی روسی اور دیگر زبانوں میں ترجمہ ہو کر آچکی ہیں اور ان کی جدوجہد کی گہرائیوں کا احساس ہو چکا ہے۔

۱۹۶۰ء کے قبل روس کے اقتصادی ماحول کی سانس جاگیرداری کے سہارے چل رہی تھی۔ کسانوں کی حیثیت غلاموں کی تھی ان کی غلامی کی وجہ سے پیداوار کی ہمیشہ کمی رہی۔ اقتصادی بدحالی بدستور قائم رہی۔ کسانوں کی زندگی میں انتشار اور بے چینی تھی۔ پیداوار کی کمی کی وجہ سے زراعت کی ترقی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ کسانوں کی یہ حالت زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہی۔ ان کی بے چینی اور انکی زندگی

کا انتشار انہیں بغاوت پر مجبور کر رہا تھا۔ یہی وجہ ہوئی کہ کسانوں نے بغاوتیں شروع کر دیں۔ ایک طوفان اٹھ گیا۔ یہ بغاوت در اصل غلامی کے خلاف تھی۔ کسان غلامی کی زندگی بسر کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس سے ان کی زندگی تباہ ہو رہی تھی۔ ان کے کردار پر برے اثرات پڑے تھے۔ انکی نسلوں کا مستقبل تاریک نظر آ رہا تھا۔ ظلم و ستم سے ان کا شعور اور ان کی فطرت مفلوج ہونے کو تھی۔ پیداوار کی کمی کی وجہ سے زراعت کی ترقی ممکن نہ تھی۔ کسانوں نے مختلف مقاموں پر حملہ بول ہی دیا۔ اسکا اثر اچھا ہوا کسانوں کی مضبوط طاقت کے سامنے زار کو سر جھکانا پڑا۔ زار نے رسم غلامی کا خاتمہ کر دیا۔ اس طرح کسانوں کو کچھ سکون ہوا اور وہ جد و جہد میں زیادہ مصروف ہو گئے۔ یہ بات کچھ زیادہ دنوں تک نہیں رہی۔ زمینداروں کا ظلم و ستم کم نہیں ہوا۔ اس ظلم و ستم میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ کسان پھر زنجیروں میں جکڑ دئے گئے۔ رسم غلامی کے خاتمہ کے بعد بھی وہ آزاد نہیں ہوئے انہیں ہر طرح سے ستایا گیا۔ زار شاہی روس میں سرمایہ داری کا ارتقا انیسویں صدی میں ہوا۔ اس کے قبل جاگیرداری اپنے پورے شباب کے ساتھ عوام پر مسلط تھی۔ عوام کو تعلیم سے ہمیشہ روکا گیا۔ انہیں اپنی زبان کو بھی سمجھنے کی اجازت نہیں تھی۔ زار شاہی حکومت عوام کی تاریخ کو عوام سے چھپانا چاہتی تھی تاکہ انہیں مستقبل کی سرحدیں اترنے کا کوئی خوبصورت راستہ نہ مل جائے یہ پیشہ ور شاعر اور گویئے تھے جو اپنی شاعری اور اپنے گیتوں میں تاریخ کو چھپانے کی کوشش کرتے تھے۔ اور انہیں عوام کے قریب کرتے تھے۔ انیسویں صدی کے شروع میں عیسائی پادری بچوں کو پڑھاتے تھے لیکن ان کی زبان بچوں کی سمجھ کی بات نہیں تھی۔ روسی زبان کو روسی عوام سے دور رکھنے کی

سازش ہمیشہ چلتی رہی۔ جمہوری تحریک نے روسی زبان کو آگے بڑھایا۔ اسی تحریک کے ساتھ ساتھ زبان کا ارتقا بھی ہوا۔ سماجی نظام کے خلفشار اور انتشار نے روسی زبان کے ارتقاد پر گہرا اثر ڈالا۔ لینن اور اسٹالن نے کسانوں اور مزدوروں کو منظم کیا اور جمہوری تحریک کو آگے بڑھایا۔ اسی جدوجہد کا نتیجہ ہے کہ عوام کو آزادی ملی اور انہیں ان کی اپنی زبان ملی جسکی مدد سے وہ اپنے تمدن کے سینے میں چاند اتار سکے اور انہیں سورج کا سونا اور پانیوں کا نیلم مل گیا۔ روسی زبان ساقی اور سرمایہ داری نظام میں بڑی مشکل سے سانس لے رہی تھی۔ اشتراکی انقلاب نے فضا صاف کردی، گرد و غبار دور ہٹ گئے۔ اور ایک خوبصورت ماحول کی تخلیق ہوئی۔ بغیر اس ماحول کی تخلیق کے روسی زبان کے ارتقاء کو آسان بنانا ممکن نہیں تھا۔

زارشاہی حکومت نے ایک طرف روسی زبان اور ادب پر ظلم کیا اور انکی ترقی کو روکا اور دوسری طرف غیر روسی قوموں پر روسی زبان رکھ کر ان قوموں کی زبان اور ان کے تمدن کو صدمہ پہنچایا۔ اس نے ایک طرف فرانسیسی زبان اور تہذیب اور دوسری قوموں کی زبان اور تہذیب کی پیروی کی اور انہیں روس کے عوام کے سر پر خواہ مخواہ ڈال دیا اور دوسری طرف غیر روسی قوموں کو جاہل رکھنے کی کوشش کی اور ان کے دماغ سے قومیت کے ہر تصور کو ہٹانے کی ترکیبیں نکالیں تاکہ یہ غیر روسی قومیں کسی طرح روسی قوموں میں جذب ہوجائیں اور دونوں کا فرق ہمیشہ کے لئے مٹ جائے۔ آذربائیجان، آرمینیا، ترکستان، کریمیا، دریائے والگا کے عوام اور انگش اور ملیس، کرغیز، باشکر، چیچین، اسقونی،

پولش، لیٹ اور یہودی سب زار شاہی نظام کے ظلم و ستم کے شکار تھے لینن نے بتایا تھا کہ سرمایہ داری ایک زبان کا نعرہ لگا کر عوام کو یکساں اقتصادی رشتوں میں جکڑنے کی کوشش کرتی ہے۔ اسلئے سرمایہ داری گھر بلو بازار کو بھی اپنے ہاتھوں میں لینا چاہتی ہے اور اس گھریلو بازار کے لئے ضروری ہے کہ یہاں کے عوام ایک زبان بولتے ہوں۔ اس سلسلہ میں کوئی بھی رکاوٹ ہو تو اسکا مقابلہ کر کے اسے ختم کرنا ضروری ہے۔ زبان کے مسئلہ کی اہمیت پرولتاری طبقہ کے لئے اس وقت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے جب یہ طبقہ اپنے حق کے لئے جد و جہد کرتا ہے۔ اس لئے کہ ذہنی پیچیدگیوں کو ختم کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ زبان پر کوئی پابندی نہ ہو۔ مادری زبان استعمال کرنے کا حق جتنا تاتاریوں کو ہو اتنا ہی حق یہودیوں کو بھی ہو۔ زبان کی مدد سے کوئی تحریک آگے بڑھتی ہے اور انقلاب کی صورت اختیار کرتی ہے۔ زبان انسانی صلاحیتوں کو ابھارتی ہے اور سنوارتی ہے۔ انسان کے شعور میں رچاؤ اور کسماہٹیں پیدا کرتی ہے۔

سنہ ١٩١٧ء کے قبل روس میں جو شہنشاہیت تھی وہ شہنشاہیت کی سب سے عظیم عمارت تھی۔ شہنشاہیت اپنی ساری حماقتوں اور چالبازیوں کے ساتھ موجود تھی۔ دنیا کے دوسرے ممالک زراعت میں اس وقت تک کافی بڑھ چکے تھے۔ لیکن روس کی زراعت اور کاشتکاری ان ملکوں سے بہت پیچھے تھی۔ ایک لاکھ تیس ہزار زمیندار (جس میں زار سب سے بڑا تھا) اور ایک لاکھ تیس ہزار ڈکٹیٹر تھے۔ جو اپنی چالبازیوں اور اپنے مظالم سے کسانوں کی زندگی بری طرح الجھا چکے تھے۔ اور اپنی معاشی اور سیاسی ملکیت کو سنبھال رہے تھے۔ اپنے ماحول میں کسانوں پر جو پابندیاں

تھیں اور جو سختی تھی اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی ہے۔ کسانوں پر سخت پابندی تھی۔ سب سے بڑی سختی یہ تھی کہ وہ اپنے گاؤں سے باہر پولیس کی اجازت کے بغیر نہیں جا سکتے تھے اور دوسرے گاؤں کے کسانوں سے کسی قسم کا ربط قائم نہیں کر سکتے تھے۔ اگر کسی کو اجازت ملتی تھی تو تھوڑی دیر کے لئے اور تھوڑے وقفہ کے لئے اس پر سخت نگرانی رہتی تھی۔ (۱۹۰۵) کی معمولی تحریک سے کچھ آسانیاں پیدا ہوئیں اور وزیر اعظم اسٹولپن نے کسانوں پر کچھ شفقت فرمانے کی کوشش کی اور ان کے ہر نئے کام کے ساتھ ان کا نام دینے لگا تاکہ ان کی شفقت کا علم سارے لوگوں کو ہو جائے۔ ان سارے اتار چڑھاؤ، نشیب و فراز اور ہمواری اور ناہمواری نے عوام کی زبانوں کے ارتقاء پر اثر ڈالا۔ ایک گاؤں کے کسانوں کو دوسرے گاؤں کے کسانوں سے نہیں ملنے کی وجہ سے زبان کی ترقی رک سی گئی۔ لوگوں کو ایک دوسرے کو سمجھنے میں دشواری ہوئی اور ہر ایک جگہ تاریکی پھیل گئی۔ معاشی حالت کے ساتھ سماجی حالت بھی ابتر ہو گئی تھی۔ پھر بھی روس میں کچھ بڑے ناول اور کچھ اہم ڈرامے لکھے گئے فن مصوری اور فن موسیقی میں بھی خوبصورت کیفیتیں، حسین انداز اور ترنم اور جھنکار پیدا ہوئے۔ ان سے بھی عظیم تخلیقات وجود میں آسکتی تھیں لیکن روس کے فنکاروں کو قید میں رکھا گیا جلا وطن کیا گیا میکنیکوب (Mechnikov) اور نیوگریدف (Vino gradov) جیسے سائنس داں اور تاریخ داں اور کووالیوسکی جیسے مفکر کو پریشان کیا گیا۔ "پوپوف" جو روس میں ریڈیو کا موجد تھا غربت کا شکار ہوا۔ اور تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ اس طرح سینکڑوں

ادیب اور فنکار ریاست کے شکار ہوئے۔ حالانکہ ان پر بھی ظلم کیا گیا۔ گورکی کی اکادمی آف سائنس کی ممبری چھین لی گئی جس پر چیخوف (…) اور کورولنکو نے احتجاج کیا اور پھر استعفیٰ دے دیا۔ مندلیف جو دنیا کا مشہور کیمسٹ تھا اسے غدار وطن قرار دیا گیا۔ روس کے ایسے کتنے فنکار اور ادیب ملیں گے جنھوں نے سائبیریا اور لندن میں زندگی گذاری اور روس کے گندے ماحول کے شکار رہ کر اس ماحول کو برداشت نہ کرسکے۔

اسی روسی انقلاب کے بعد عوام کی حالت بدل گئی تو زبان کا بھی ارتقا ہوا۔ سوویت حکومت نے سوویت یونین کی تمام زبانوں کے مسئلہ کو اشتراکی اصولوں کی بنیاد پر حل کیا۔ اسلئے کہ پرولتاری طبقہ سماجی ماحول میں جب بھی جدوجہد کرتا ہے تو وہ زبان کے مسئلہ کو بھی پیش نظر رکھتا ہے یہاں بھی پرولتاری طبقہ نے زبان کے مسئلہ کو نظر انداز نہیں کیا۔ دوسری تحریکوں کے ساتھ ساتھ زبان کی بھی تحریک قائم رہی۔ اور زبان کا بھی ارتقاء ہوتا رہا۔ اور پھر اشتراکی اصولوں کی بنیاد پر انقلاب کے بعد زبان کے مسئلہ کو بھی حل کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ کاٹسکی کے خیالات کی بھی سخت مخالفت کی گئی۔ اور ان۔ رائے۔ مارکس خیالات پر بھی سخت تنقید ہوئی۔ اسٹالن نے کاٹسکی کو اندھا وطن پرست ثابت کرتے ہوئے یہ لکھا کہ اس کے خیالات پر مارکسزم کا صرف لبادہ ہے۔ اندر وہی تنگ نظری ہے اور غداری ہے جسکی مذمت عوام کرتے رہے ہیں۔ لینن نے بھی کاٹسکی کے خیالات کی سخت مذمت کی تھی سنہ ۱۹۲۵ء اور سنہ ۱۹۱۰ء میں اسٹالن نے کاٹسکی کی اندھی وطن پرستی کی دھجی اڑادی اور غداری اور تنگ نظری پر مارکسزم کا جو نقاب تھا وہ الٹ گیا۔ کاٹسکی نے

جرمن زبان کی حمایت کی تھی۔ اور بتایا تھا کہ روس کی قومی اور عوامی زبان
جرمن ہونی چاہیئے۔ اسلئے کہ انیسویں صدی عیسوی میں جرمنی اور آسٹریا کی
مشترکہ حکومت میں اشتراکی انقلاب کی فتح اور کامیابی کی وجہ سے جرمنی
ایک واحد قومی زبان بن گئی تھی۔ جرمن تہذیب سے عوام کو جرمن کلچر کے
افراد سمجھتے تھے۔ اسلئے ایسی قومیت سے دور رہنا اچھا ہے جس کی
رگیں ٹوٹ گئی ہیں۔ ایک زبان کا نعرہ کاؤتسکی کے بعد کچھ اور لوگ
بھی لگانے لگے۔ لیکن چونکہ اشتراکی اصولوں کی بنیاد پر زبان کے مسئلے
حل ہو رہے تھے۔ اسلئے عوام حقیقت کو سمجھ رہے تھے۔ عوام نے ہر
ایسی آواز کی سخت مخالفت کی جس میں روس میں ایک زبان رائج کرنے
کا نعرہ تھا۔ اسٹالن نے اسکی بھی سخت مخالفت کی کہ روس میں صرف
روسی زبان کا وجود رہے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ حقیقت ہے کہ سوویت
یونین میں روسی زبان بولنے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے لیکن
اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ روسی زبان تمام جمہوریتوں کی مشترکہ زبان
بن جائے۔ روسی زبان کو قومی زبان تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس
زبان کے علاوہ دوسری زبانوں کے ساتھ سخت بے انصافی ہو اور
عوام کے ساتھ غداری کی جائے۔ اور انہیں زبردست فریب میں رکھا جائے
کسی بھی زبان کو اس قسم کا خاص حق دینا عوام کے ساتھ غداری ہے۔ تمام
قومیتوں پر کسی ایک قومیت کی زبان زبردستی رکھ دینا عوام کو فریب
دینا ہے یہی وجہ ہے کہ بالشویک پارٹی نے انقلاب سے قبل قومی زبان کو
ختم کرنے کی تحریک چلائی تھی۔ سوویت آئین میں قومی زبان کی حمایت
نہیں ملے گی۔ اس لئے کہ سوویت یونین میں کوئی قومی زبان نہیں ہے

سپریم سوویت کی ساری کارروائیوں کو ساتھ مختلف زبانوں میں شائع کیا جاتا ہے۔ اسمبلی کے ممبران اپنی زبان میں تقریر کرتے ہیں۔ ترجموں کا خاص انتظام رہتا ہے۔ اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور کچہریوں میں ان کی مقامی یا علاقائی زبانیں استعمال ہوتی ہیں۔ ماہرین لسانیات نے ان زبانوں کے لئے رسم الخط ایجاد کئے۔ جن زبانوں کے رسم الخط نہیں تھے یا رفتہ رفتہ ختم ہو چکے تھے استالن نے اکادمین ان، یا، مار کے خیالات کی سخت مخالفت کرتے ہوئے اصلیت کو جس طرح نمایاں کیا تھا اس سے بہت ساری باتیں صاف ہو جاتی ہیں۔ مار کے غیر مارکسی اور غیر سائنسی خیالات کی دھجی اڑائی۔ مار کے پاس بھی زبان کے متعلق ایک خاص نظریہ تھا۔ اس نظریہ کا بھی ایک اپنا کردار تھا۔ لیکن یہ کردار قطعی طور پر غیر مارکسی اور غیر سائنسی تھا۔ مار خیالات کو زبان سے بالکل علیحدہ کر دیتا ہے یعنی خیال اور زبان کا جو گہرا تعلق ہے اس تعلق کے وجود سے وہ انکار کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عوام ایک دوسرے سے بغیر زبان کی مدد کے مل سکتے ہیں۔ زبان کی مدد کے بغیر ایک دوسرے کے ساتھ رہ کر سماجی زندگی میں جدوجہد کر سکتے ہیں اور یہ سب کچھ خیال اور سوچ کی مدد سے ہو سکتا ہے۔ زبان کی حیثیت قطعی ثانوی ہے۔ مار جس خیال کی طرف اشارہ کرتا ہے وہ خیال زبان سے بالکل مجرد ہے۔ اسے زبان کے کسی عنصر سے کوئی تعلق نہیں ۔۔۔ اس طرح مار تصورات کی خیالی دنیا میں اور زیادہ بھٹکنے لگتا ہے۔ خیالی دنیا میں اپنی ایک عمارت بناتا ہے اور اسی عمارت سے نیچے عوام کی حالت اور زندگی دیکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی خیال زبان کے بغیر وجود میں نہیں

آسکتا ۔ زبان کے عناصر جب کوئی بنیاد بنا لیتے ہیں تو کوئی خیال پیدا ہوتا ہے۔ زبان کے عناصر سے پاک رہکر کوئی خیال جنم نہیں لے سکتا۔ ان۔ دائی۔ مار زبان کو ذہنی تعمیر کہتا ہے۔ یہی خیال مار کے سارے خیالات کی بنیاد ہے۔ وہ زبان کے طبقاتی کردار کو سمجھنے سے مجبور رہے ہے۔ اس قسم کے خیالات کی پیروی سے زبان کی تاریخ کی ساری حقیقتوں سے انکار کرنا پڑے گا۔ اور زبان اور کلچر کے صحیح تعلق کو سمجھنے سے مجبور ہونا ہوگا۔

تخلیق کی جدوجہد بڑی جدوجہد ہوتی ہے۔ یہ تخلیق اچھی بھی ہوسکتی ہے اور بری بھی۔ معاشی زندگی کو خوشگوار بنانے کی جدوجہد سب سے بڑی تخلیقی جدوجہد ہے۔ اسی سے دوسری جدوجہد اور محنت اور مشقت کا رشتہ قائم رہتا ہے۔ معاشی زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش ہی ایک بہت بڑے معجزہ (Miracle) کا انتظار کراتی ہے۔ انسان کی قوت تخلیق اس معجزہ کو حادثہ سمجھتی ہے لیکن دراصل اس معجزہ کی تخلیق انسانی قوت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ عوام اپنے دماغ کی قوت سے مدد لیکر فطرت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور انسان اور فطرت کے تعلق کا پتہ چلاتے ہیں۔ یہ ساری باتیں انفرادی طور پر نہیں ہوسکتی تھیں اسلئے کہ پیداواری قوت اور جدوجہد ایک انسان کو دوسرے انسان کے قریب کرتی ہے۔ اور ان کے تعلق کو بہتر سے بہتر بناتی ہے۔ انسان کی عقل پیداواری قوت اور تخلیق کی جدوجہد سے علیحدہ رہ کر زندہ نہیں رہ سکتی ہے۔ انسان اس طرح جب ایک دوسرے کے قریب آتا ہے تو زبان کی تخلیق ہوتی ہے۔ زبان کی تخلیق پیداواری اور سماجی کشمکش کا نتیجہ ہے۔ اسی قوت کا نتیجہ ہے کہ انسان زبان کی تخلیق ارتقا اور اسکے کام

اس اپنے شعور سے مدد لیتے وقت گھبراتا نہیں

ویدک زبان ایک نہایت ہی دلفریب زبان ہے۔ اس زبان کے ذریعہ جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ ان پر رشک ہوتا ہے۔ الفاظ کھلے اور اعلیٰ جذبات اس زبان کے ذریعے ہمارے سامنے آگئے ہیں۔ ہر ضروری اور خاص لفظ کو اس طرح رکھا گیا ہے کہ اسکی شان بڑھ گئی ہے۔ جہاں کوئی لفظ کسی جملہ کے آگے آکر رک گیا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس لفظ نے ان بہت ساری باتوں کو سمیٹ کر ایک جگہ رکھ لیا ہے۔ جو باتیں آگے بڑھنا چاہتی ہیں اس سے لطف اور چاشنی اور زیادہ بڑھ جاتی ہے کلاسیکی یونانی زبان میں بھی یہ خصوصیت نہیں ہے حالانکہ اسمیں وہ بہت ساری خصوصیتیں موجود ہیں جو ویدک زبان میں ہیں۔ ویدک زبان کی گرامر کا احترام اور زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ جب یہ زبان ہمارے شعور اور جذبات کو یکساں طور پر مطمئن کر دیتی ہے۔ ہندوستان کی قدیم کتاب جس کا موضوع لسانیات ہے۔ وہ یاسکا کی نیرکت ہے۔ اس کتاب میں ویدی الفاظ کی تشریح کی گئی ہے۔ پانچویں صدی قبل مسیح کے ویدک الفاظ جو اپنی بعض خصوصیتوں کی وجہ سے ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں ان کے متعلق یاسکا کی کتاب نیرکت میں بہت ساری دلچسپ باتیں ملتی ہیں۔ پانینی کی مشہور گرامر آشتا دیائی (آٹھواں باب) چوتھی صدی قبل مسیح کے [illegible] ترتیب پا چکی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ پانینی نے زبان کو [illegible] اور اسکے بعد زبان کا بہت سارا حسن ختم ہو گیا۔ اس زبان کی [illegible] تعریف [illegible] مگر [illegible] کون انکار کر سکتا ہے [illegible] پانینی گرامر [illegible]

لو

نویں صدی کے قبل تک دنیا کے کسی ملک میں اتنی بڑی تحقیق نہیں ہوئی۔ آستا دھیائی ایک نہایت ہی سائنٹفک گرامر ہے جس میں قواعد کے تقریباً چار سو اصول ہیں۔ ان اصولوں کو عوام میں کامیابی نہیں ہو سکی۔ بعد میں جو بھی گرامر تیار ہوئی اسکی بنیاد پانینی کی گرامر ہے۔ پتانجلی کی کتاب مہابھاشیہ (دوسری صدی ق-م) اور جیا دتیہ اور روامانا کی کتاب کاشکا ورتی (ساتویں صدی ق-م) میں پانینی کا انداز اور اسکے اصولوں کی تیز روشنی دیکھی جا سکتی ہے۔ بعد میں کچھ بڑے ادیبوں نے پانینی کے اصولوں سے اختلاف کیا۔ اور کتابیں لکھیں لیکن خاص طبقوں میں پانینی کافی مقبول ہو چکا تھا۔ کلاسیکی زبان عوام کی زبان نہیں بن سکی۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ زبان کبھی مری نہیں۔ مندروں اور حکومت کی زبان بن کر اونچے طبقوں میں بہت مقبول رہی۔ اور نیچے طبقہ میں بھی بہت کچھ سمجھی جانے لگی۔

رگ وید کے ایک ہزار اٹھائیس (1028) منتروں اور دعاؤں میں مختلف اندازِ بیان ہے اور سبھوں کا اپنا حسن اور معیار ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں ہوتا کہ مختلف ادیبوں کی کاوشوں نے انہیں زندگی دی ہے۔ ایک دو نہیں لگ بھگ پانچ صدی رگ وید کے منتروں اور دعاؤں میں اپنا دامن پھیلائے ہوئی ہے۔ دس دائروں (منڈلا) میں رگ وید کو تقسیم کیا گیا ہے۔ دوسرے اور ساتویں حصے میں قدیم منتروں کا رنگ و روپ دیکھا جا سکتا ہے۔ پہلے، آٹھویں اور دسویں حصوں میں بہت بعد کی چیزیں ہیں۔ نواں حصہ سوم دیوتا کی عظمت کا احساس گہرا دلاتا ہے

یہ ضرور ایک حقیقت ہے کہ رگ وید کے منتروں میں بار بار ایک ہی بات کہی گئی ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تمام منتروں کو پڑھنے کے بعد

ایک خاص نقطۂ نظر پیدا ہوتا ہے۔ بہت ساری عام باتیں ملکر کچھ خاص باتوں کو جنم دیتی ہیں اور یہ خاص باتیں ہمارے کلچر کی عظمت کا گہرا احساس دلادیتی ہیں۔ رگ وید میں زندگی اور موت کے فلسفوں کی تلاش بیکار ہے اسلئے کہ ویدی آریہ زندگی اور موت کا کوئی خاص تصور نہیں رکھتے تھے۔ جنت اور جہنم کے متعلق کچھ مبہم اشارات مل جاتے ہیں۔ دوسری پیدائش کے متعلق بھی ویدی آریوں نے سنجیدگی سے نہیں سوچا تھا۔ ان باتوں کے باوجود رگ وید میں اس بات کا پتہ چل جاتا ہے کہ آریہ موت کو زندگی کی آخری منزل نہیں سمجھتے تھے۔ رات کے بعد صبح اور موت کے بعد زندگی کی ایک ہلکی سی تصویر مل جاتی ہے

رگ وید کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسان پہلی بار زندگی کو گھور گھور کر دیکھ رہا ہے۔ اسکی روح میں ایک تڑپ ہے۔ ایک جستجو ہے۔ انسان روحانی قوتوں کو حاصل کرنے کے لئے مادی زندگی سے دلچسپی لے رہا ہے۔ حیرت، شک وشبہ، تلاش اور جستجو کی ایک دنیا آباد ہے۔ آنکھوں کے سامنے جو چیزیں ہیں ان کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ انسان پہلی بار جیسے گہری نیند سے بیدار ہوا تھا۔ اسکے سامنے کچھ سوال تھے، کچھ اشارے تھے۔ تجربے بھی اور وہم بھی۔ اندر دیوتا کے گیتوں میں جو آرزو، تمنائیں، محبت اور امنگیں ہیں۔ ان میں زبان کے نکھار اور تازگی کو دیکھا جاسکتا ہے۔ مثالوں اور تشبیہوں کا بھی ایک نگار خانہ موجود ہے۔ ان گیتوں میں زندگی کی لذت کا بھی احساس ہوتا ہے سوما سے انسان اسی طرح جاگ جاتا ہے جس طرح بادل گرجتے ہیں اور ہوا چلتی ہے (رگ وید ۱۰ – ۱۱۹) سوما سے انسان کی روح میں وہ

تیزی آجاتی ہے جو رتھ کے تیز گھوڑوں میں ہوتی ہے۔ (رگ وید ۱۰ - ۱۱۹)
دو دنیا (جنت اور دنیا) کی کیفیتیں ہمارے نصف جسم میں بھی نہیں
آسکی ہے۔ کیا ہم نے سوما کے قطروں کو اپنے جسم میں نہیں اتارا ہے
(رگ وید ۱۰ - ۱۱۹) پرجاپتی کا بھی مکمل روپ رگ وید میں پہلی بار نظر
آتا ہے جس نے دنیا کی تخلیق کی ہے۔ جس نے انسان کو سانس کی
لہریں عطا کیں۔ جس نے طاقت بھی دی اور موت کے ساتھ دائمی زندگی
بھی۔ جسکی عظیم شخصیت نے برف سے بھرے ہوئے پہاڑوں کا سلسلہ
قائم کر دیا ہے۔ جو سمندر ہے۔ جس کے حکم سے آفتاب نکلتا ہے۔ جنت
اور دنیا کو جس نے مستحکم کیا۔ اور عظمت دی (رگ وید ۱۰ - ۱۲۱) درونا
دیوتا کے لئے بھی گیت ہیں جو بہت اہم ہیں۔ (یونانی دیوتا اورانوس
(Uranos) پر بھی غور کرنا چاہیئے) رگ وید میں اسکی شہادت صاف
طور پر کہیں نہیں ملتی۔ کہ اس وقت دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے
انسانوں کی قربانی ہوتی تھی۔ قانونی طور پر جو باتیں اس سلسلہ میں
ہوئی ہیں ان میں اشاریت کی اہمیت زیادہ ہے۔ پرش کے متعلق
جو باتیں ہیں وہ دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔ ان باتوں میں انسان کی عظمت
کا بھی گہرا احساس ہوتا ہے۔ کہا گیا ہے کہ پرش کے ہزاروں سر، ہزاروں آنکھیں
اور ہزاروں پیر ہیں۔ پرش نے ساری زمین کو سینے سے لگا لیا ہے (رگ وید
۱۰ - ۹۰) رات کو ستاروں سے بھرے ہوئے آسمان کی دیوی کہا گیا ہے
اور صبح کاذب کی بہن بھی۔ صبح (اوشا) کے گیتوں میں بڑی جان ہے۔ شاعرانہ
نزاکتیں بھی ہیں۔ صبح کاذب کے حسن کی تعریف جس طرح کی گئی ہے وہ مشرقی
شاعری کی عظمت کو اور نمایاں کرتی ہے (اوشا کے ساتھ یونانی "ایوس"

اور لاطینی اور درا پر بھی غور کرنا چاہیئے)

انسان خدا اور دنیا کے متعلق تصورات اپنی بہت ساری خصوصیتوں کے ساتھ اُپنشادوں میں ملتے ہیں۔ قدیم ہندوستان کے جنگل میں رہنے والے سادھو اور مہاتماؤں کے خیالات کی تصویریں اپنشادوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ دنیا کی تخلیق کے متعلق قدیم خیالات کو سمجھنے کے لئے ہمیں اس کا سہارا لینا ضروری ہے

اپنشاد کے متعلق کہا جاتا ہے کہ گوتم بدھ کے قبل ہی اسکے بہت سارے حصے لکھے جا چکے تھے۔ مختلف اپنشادوں میں مختلف باتیں ملتی ہیں۔ زبان اور خیالات کا فرق موجود ہے۔ چار سو سال قبل مسیح کی بھی جھلکیاں ملتی ہیں۔ رگ وید کے منتروں سے اپنشاد کا گہرا تعلق سمجھنا اور خواہ مخواہ ربط پیدا کرنا غلط ہے۔ یہ ضرور ہے کہ کچھ روایتیں آگے بڑھی ہیں۔ دنیا کے حالات اور زندگی کے قانون پر پہلی بار بھرپور طریقہ سے اپنشادوں میں باتیں ملتی ہیں۔ ایشاء کے مخصوص خیالات کی بنیاد پر اپنشاد ہے۔ وہ خیالات جن پر ہم آج بھی فخر کرتے ہیں۔ اور جن کی انفرادیت پر ہمیں آج بھی ناز ہے۔ رگ وید میں انسان حیرت سے ہر چیز دیکھتا ہے شک و شبہ اور وہ جستجو موجود ہے جس میں دلچسپی اور مسرت کا جذبہ ہے اپنشادوں میں جو حیرت ہے۔ اسمیں غور و فکر بھی ہے وہ جستجو ہے جس میں تکلیف اٹھا کر اور زندگی کو مصیبت میں ڈال کر کچھ حاصل کرنے اور کچھ جان لینے کی بات ہے۔ حقیقت اور سچائی کے اصولوں کو سمجھنا، ان کی باریکیوں کو جان لینا، انفرادی زندگی کی روحانی قوتوں پر دھیان دینا اور کائنات کی روح کے قریب جانا اپنشاد کی تعلیم ہے۔ خدا کیا ہے؟ خودی (آتما)

کیا ہے؟ کائنات کی روح (برہما) کیا ہے؟ دماغ کی وسعت کیا ہے؟ مادہ کیا ہے؟ ہمارے شعور کے پس پردہ کون سی شخصیت (پرش) ہے آریاؤں کے سوچنے کے ڈھنگ کا ہم اچھی طرح تجزیہ کرتے ہیں۔ ان کے خیالات کے ارتقاء کو اپنشاد کی مدد سے اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے۔ آٹھ سو سال قبل مسیح کی اپنشادیں ہندوستانی خیالات کے ارتقاء کو دیکھا جاسکتا ہے۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ تہذیب آگے بڑھ گئی تھی۔ قدیم اور نئی تہذیب میں جو ٹکراؤ اور کشمکش تھی۔ اسکی جھلکیاں ہر جگہ نمایاں ہیں۔ آریاؤں نے جو خیالات، تصورات اور اصول دئے ان کی بلندی، عظمت اور حسن کو اپنشادیں دیکھا جاسکتا ہے۔ کچھ ماہرین یہ بھی کہتے رہے ہیں کہ اپنشاد نے ماضی سے اپنا رشتہ توڑ لیا تھا۔ حالانکہ یہ نہایت ہی غلط بات ہے اسکی بنیاد غلط اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ اپنشادیں ایسی کوئی کوشش نہیں ہے جس سے یہ سمجھا جاسکے کہ اس میں ماضی سے رشتہ توڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ماضی کی کچھ اچھی روایتیں آگے اس طور پر بڑھی ہیں کہ ان سے کائنات کے اسرار رموز کو سمجھنے میں مدد لی گئی ہے۔ اپنشادیں زندگی کی سچائی پر زور دیا گیا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس سلسلہ میں کوئی خاص اصول یا تھیوری پیش نہیں کی گئی ہے۔ اپنشاد کی تعداد ایک سو آٹھ کہی جاتی ہے۔ جن میں دس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ سامکارا کی اہمیت سے آج تک کسی نے انکار نہیں کیا۔ یہ ضرور ہے کہ اسکی تخلیق کا صحیح وقت ہمیں اب تک معلوم نہیں۔ قدیم اپنشاد کی تخلیق کا وقت ایک ہزار سال قبل مسیح سے تین سو سال قبل مسیح کا عرصہ بتایا جاتا ہے۔ قدیم اپنشاد نثر میں ہیں۔ ان میں انشاپردازی کا خاص رنگ موجود ہے۔ دلفریب جملوں میں

قیمتی خیالات کی پیشکش سے انسان جھوم جھوم جاتا ہے۔ ذہن زندگی کے معجزوں کو اس لئے دیکھنا چاہتا ہے کہ ان کی حقیقت اور سچائی نمایاں ہو اس کوشش اور جد وجہد میں ایک قسم کا سائنٹفک طریقہ نظر آتا ہے۔ انسان اپنے آپ کو اچھی طرح پہچان لے۔ خودی پر زور دے۔ انفرادی خودی کی اہمیت کو سمجھے۔ کائنات کی خودی کو سمجھے۔ اندر کی حقیقت اور باہر کی حقیقت کے تعلق کو اچھی طرح جان لے۔ انفرادیت پر بھی بہت زور دیا گیا ہے اور اس طرح اجتماعیت کا نظریہ اچھی طرح نہیں ابھر سکا ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا بھی غلط ہے کہ اس سے قدیم ہندوستانیوں کی تنگ نظری ظاہر ہوتی ہے۔ اپنشاد میں کہا گیا ہے کہ انفرادی زندگی سے بلند کوئی چیز نہیں ہے۔ انسان کو اپنی کمزوریاں دور کر کے اپنی تکمیل کے لے اٹھنا چاہیے انسان کو مکمل انسان ہونے کے لئے کچھ منزلوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ اپنشاد کے جو خالق تھے ان کے نام اور ان کی زندگی ہمارے سامنے کھل کر نہیں آتی ۔ ورنہ ہم ان کے شعور ذہنی پس منظر اور ان کی زندگی کے مطالعہ سے اپنشاد کی عظمت کو اور زیادہ سمجھ سکتے۔ کچھ جو نام لئے جاتے ہیں ان میں ماہی داسا اتاریہ، رکوا، سانڈیلے، اُدوالاکا، بالاکی، ستیہ کام، جابالا، اجے والی وغیرہ کے نام اہم ہیں

بیرہادارنائیکا کی اپنشاد میں انسان کی انفرادیت اور خودی کی باتیں بہت ہی دلچسپ ہیں۔ تخلیق کی کہانی میں یہ کہا گیا ہے کہ شروع میں صرف انفرادیت تھی جو تنہا تھی۔ اسے "پرش" (شخص) کہا گیا۔ اس نے چاروں طرف نظر ڈالی لیکن اسے صرف اپنی خودی اور انفرادیت نظر آئی۔ پہلی بار اس نے یہی کہا۔ "یہ میں ہوں۔" "میں" کے علاوہ اور کچھ ...

اسکا نام ہی "میں" ہوگیا۔ اس نے تمام کمزوریوں کو دور کر دیا۔ تنہائی میں اسے خوف معلوم ہوا لیکن اس نے سوچا کہ جہاں "میں" ہوں اور کوئی نہیں ہے۔ وہاں خوف کس بات کا؟؟ اس طرح خوف اس سے دور ہو گیا اس نے سوچا اسکی زندگی میں مسرت ہے۔ مسرت کیلئے کسی اور کی بھی ضرورت تھی۔ اس نے اپنی خودی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اور اس طرح شوہر اور بیوی کا وجود ہوا۔ اس نے اپنی بیوی کو سینے سے لگایا اور پھر انسان کی پیدائش شروع ہو گئی۔ اسکی بیوی نے سوچا کہ چونکہ وہ اپنے شوہر کی خودی سے پیدا ہوئی ہے۔ اسلئے اسے شوہر سے دور رہنا چاہیئے۔ وہ گائے بن گئی۔ لیکن اسے دیکھکر حیرت ہوئی۔ کہ اس کا شوہر سانڈ بن گیا۔ اور دنیا میں گائے کی پیدائش ہوئی۔ اس طرح وہ مختلف جانوروں کی صورت اختیار کرتی رہی۔ اور اسکا شوہر بھی جانور بنتا رہا۔ اور مخالف جنس بنکر مختلف جانوروں کو پیدا کرتا رہا۔ اس طرح اس نے چیونٹی تک جوڑے پیدا کئے۔ اب اسے محسوس ہوا کہ دراصل وہ بھی "تخلیق" ہے اور اس نے تمام چیزوں کی تخلیق کی ہے۔ تمام دیوتاؤں کا روپ اسی میں ہے۔ اسے کوئی دیکھ نہیں سکتا۔ اسی کے نام سے سارا کام ہوتا ہے۔ یہ خودی وہ رہستہ ہے جہاں کوئی سب کچھ جان لیتا ہے۔ جو کچھ گم ہو جاتا ہے وہ اسی رہستہ سے حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ خودی ایک بیٹے سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ دولت سے بھی زیادہ عزیز اور ساری چیزوں سے زیادہ عزیز ہے۔ محبت کے مقصد کو حاصل کرنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ خودی کو عزیز رکھا جائے۔ اس نے عوام کی تخلیق کی۔ طبقوں کی تخلیق کی۔ ذاتوں کی تخلیق کی، قانون اور طاقت کی تخلیق کی۔

اپنشاد میں انسان اپنی مسرتوں کا آپ خالق بن جاتا ہے اور ساتھ ساتھ اپنی قبر خود ہی تیار کرتا ہے۔ دوسری پیدائش پر کافی زور دیا گیا ہے انسان جو کچھ کرتا ہے اور جیسا کرتا ہے۔ اسی کے مطابق وہ موت کے بعد پھر دنیا میں پیدا ہوتا ہے۔ اور اپنے عمل کا پھل پاتا ہے۔ ویدک اور مذہبی تصورات یہاں اور آگے بڑھ گئے ہیں۔ کٹھا کی اپنشاد میں موت پر فتح حاصل کرنے جو باتیں ہیں وہ بہت ہی دلچسپ ہیں اور ان سے قدیم تصورات کے متعلق بہت کچھ معلوم ہوتا ہے۔ قدیم روایتیں کس طور پر آگے بڑھی ہیں۔ ان کی بھی تصویر ہم دیکھ لیتے ہیں۔ دنیا کی مختلف منزلوں کی تمام حقیقتیں انسان کے قریب آتی ہیں اور اس بڑی حقیقت کا احترام کرتی ہیں۔ انسانی دماغ کو فطری طور پر خالص مادی شے سمجھا گیا۔ اپنشاد میں کہا گیا ہے کہ بغیر دماغ (پراجنا) کے انسان کی زبان میں طاقت نہیں آ سکتی ہے۔ دماغ شعور سے زیادہ وسیع ہے۔ شعور دماغ کا ایک حصہ ہے۔ وہ کوئی دنیا نہیں ہے بلکہ روحانی دنیا کو سمجھنے کی ایک قوت ہے۔ شویتا شواتر کی اپنشاد میں ایک خدا کا تصور ملتا ہے۔ اس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ خدا انسان کے اندر ہے اور اپنے آپ کو پہچان کر انسان خدا کو پہچان لیتا ہے

اپنشاد میں ایک پیغمبر کی نظر ملتی ہے۔ کائنات اور زمین کی حقیقتوں پر اعتماد ملتا ہے۔ انسان کے وجود پر ایمان ہے۔ مادی زندگی کی خوشبو، روحانی زندگی کی عظمت، انسان کی خاص حیثیت، انسانی زندگی کا ایک صحت مند تصور، موت پر فتح حاصل کرنے کی تمنا، ایک اپنے دور کی خصوصیتیں سب کچھ ملتی ہیں۔ قدیم مفکروں نے سوچا کہ زندگی کی تخلیق پانی سے ہوئی ہے۔ برہمن کے معنی غلط ہی سمجھا گیا ہے۔ اپنشاد میں آئے نہ گا

لفظ اسی لئے آیا ہے۔ اس لئے اپنشاد کی بہت سی باتوں کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ یہاں ذگ کی اپنشاد میں ایک سچے اور کامل انسان کی جو تصویر ملتی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہندوستانی ابتداء ہی سے انسان کو کتنا بلند اور کتنا عظیم سمجھتے تھے۔ اشاروں، کنایوں اور دلچسپ کہانیوں سے زندگی کے بہت سارے اسرار و رموز کھول دئے گئے ہیں۔ وہ وقت تھا جب زندگی کو سمجھا جا رہا تھا۔ ایسے وقت میں زندگی کو اسی طرح سمجھانا جس طرح سمجھا گیا نہایت ہی مشکل کام تھا۔ زندگی کے حقائق کو سمجھنے کے لئے بڑی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اسکے بعد سمجھانے کی اتنی ہمت رہی اور اتنے اچھے ڈھنگ سے باتیں ہوئیں۔ یہ دیکھکر سخت حیرت ہوتی ہے۔

مہا بھارت روایتوں، کہانیوں اور سیاسی و سماجی حالات کی مکمل تصویر ہے۔ مہا بھارت میں ہندوستان کو متحد ہو جانے پر زور دیا گیا ہے اور بنیادی باتوں میں ہم کبھی اس حقیقت کو فراموش نہیں کر سکتے۔ مہا بھارت کا موضوع دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس کے متعلق صرف اس طور پر سوچنا کہ وہ صرف ایک رزمیہ ہے مناسب نہ ہوگا۔ مہا بھارت کا وسیع موضوع ہے وہ مذہب، اخلاق، فلسفہ اور مادی زندگی کے بہت سارے مسائل کی سرحدوں میں بے اختیار اتر جاتا ہے۔ اجتماعی شعور کی جھلکیوں کو مکمل طور پر دیکھنے اور پرکھنے کے لئے یہ ایک بہت بڑی تخلیق ہے۔ ہندوستان کے کلاسیکی ادب کا تجزیہ مہا بھارت کے بغیر پھیکا اور بیکار ہوگا۔

مہا بھارت میں ۹۰،۰۰۰ (نوے ہزار) سے زیادہ

ہیں۔ جن سے اس رزمیہ کا کردار صاف طور پر ابھر آتا ہے۔ دنیا کے ادب میں اتنی بڑی اور طویل نظم آج تک نہیں لکھی گئی۔ تحقیق سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ویدک دور میں مہابھارت یا مہابھارت نام کا کوئی رزمیہ نہیں تھا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس تخلیق کی بہت ساری باتیں وہی شاعرانہ انداز اور نزاکتیں رکھتی ہیں جو چھٹی صدی قبل مسیح کی ہماری خصوصیتیں سمجھی جاتی ہیں۔ چوتھی صدی قبل مسیح مہابھارت کا کہیں نام و نشان نہیں ملتا۔ اس عظیم تخلیق میں ہمیشہ تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ تمام باتوں کی تخلیق کا کوئی ایک وقت کہنا مناسب نہ ہوگا ہر حصہ کی تخلیق کے وقت کو سمجھنا ہوگا۔ پھر کہیں اس عظیم رزمیہ تخلیق کی عظمت کا گہرا احساس ہو سکے گا۔

مہابھارت کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ دور جنگ کا دور تھا۔ مغربی ہندوستان کی جو تہذیب مہابھارت میں نظر آتی ہے۔ اس تہذیب میں اتنی بلندی اور اتنا وقار نہیں جتنی بلندی اور جتنا وقار رامائن میں نظر آتا ہے۔ رامائن میں مشرقی ہندوستان کی ایک اعلیٰ تہذیب کے نمونے موجود ہیں۔ یہ درست ہے کہ مہابھارت اور رامائن میں صرف دو مختلف دور کے ماحول کی عکاسی نہیں بلکہ ہندوستان کے دو مختلف حصوں کے ماحول کی عکاسی ہے۔ مہابھارت سے اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح مغربی ہندوستان میں مشرقی ہندوستان کے حالات سے الگ کوئی تہذیب تھی۔ مہابھارت کی تہذیب میں زمین ہی سب سے بڑی دولت تھی۔ زراعت سب سے اہم پیشہ تھا۔ لوگ انسانی فطرت میں بہادری اور انتقام کے جذبوں کو اہم سمجھتے تھے

سیاسی اور کلچرل تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ کوروؤں کی حکومت (کوروکشیتر موجودہ دہلی) میں جو خانہ جنگی ہوئی۔ اسکی حالت کی مکمل تصویر مہابھارت میں دیکھی جاسکتی ہے۔ روایتی طور پر ویاس کو مہابھارت کا خالق کہا جاتا ہے جس نے اپنے شاگرد وشام پیاین کو اسکی تعلیم دی۔ وشام پاین جلسوں میں مہابھارت پڑھا کرتا تھا۔ اس رزمیہ میں ہزاروں کردار ہیں۔ بہت سارے کردار اس طور پر بھی بہت اہم ہیں کہ ان کے مقابلہ میں دنیا کے تمام ادب سے کردار پیش نہیں کئے جاسکتے

اندھا دھرتراشٹر ہمیشہ اس کوشش میں لگا رہتا ہے کہ کام درست ہو۔ وہ اچھے اور نیک کام کرنے کے لئے بے چین ہے اس کردار میں تردد پیدا کر کے اسے بہت زندگی بخش دی گئی ہے اسکی اس بےچینی سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اور وہ ہمیشہ برے کام کیطرف چلا جاتا ہے۔ حالات اور افراد اسے برے کام کی طرف لیجاتے ہیں۔ اور اسکی تمام تمنائیں اور آرزو ڈوب جاتی ہیں۔ پانچ بھائیوں میں یدھشٹر سب سے بڑا ہے۔ وہ نیک ہے۔ سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتا ہے حالات کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ غلط اور صحیح رستوں کا فرق سمجھتا ہے۔ نیکی کو اپنی دولت سمجھتا ہے۔ اس کے باوجود اسکے کردار میں کچھ کمزوریاں ہیں۔ جو خوبی کم اور حالات کے مطابق زیادہ ہیں۔ ارجن کے کردار میں بہت جان ہے۔ وہ بہادر رحمدل، جدوجہد کا خواہش مند اور نیک ہے۔ بھیم اپنے طور پر کچھ الجھا ہوا ہے۔ بہت طاقتور ہے لیکن زیادہ ذہین نہیں ہے۔ وہ بیدی کے کردار میں اس وقت کی عورت کے کردار کا ایک نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ وہ ایک دیندار عورت ہے۔ اس کے

جذبہ کو جب بھی ٹھیس پہنچی ہے اسکی روح تلملا جاتی ہے۔ پانچ شوہروں کے ساتھ اسکی محبت، اسکا خلوص، اسکی وفاداری یکساں ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے کرداروں میں بھی بہت جان ہے۔ انسانی نفسیات کی سچی عکاسی ہر جگہ موجود ہے۔ ہر کردار قربانی کے لئے قدم بڑھائے ہوئے ہے۔ عورتوں کے کردار میں ہم کنتی (Kunti) کو بھی فراموش نہیں کر سکتے۔ جب پانڈو بارہ برس کے لئے دور ہو جاتے ہیں تو وہ دیدورا کے مکان میں رہتی ہے اور کرشن کے ذریعہ اپنے لڑکوں کے پاس پیغام بھیجتی ہے۔ پیغام میں راجپوت قوم کا وقار ہے۔ وہ اپنے لڑکوں کو یہی پیغام دیتی ہے کہ وہ مر جائیں یا فتح کریں۔ وہ کسی لمحہ اپنے لئے اپنے لڑکوں کو لڑنے پر مجبور کرتی ہے۔ اسے اپنی زندگی کی کوئی پرواہ نہیں۔ جب پانڈو کامیاب ہوتے ہیں اور انکی سلطنت مضبوط ہو جاتی ہے تو وہ دھرو شٹر کے ساتھ جنگل چلی جاتی ہے اور وہاں اندھے شوہر کی خدمت میں زندگی ختم کر دیتی ہے۔ مہابھارت کی اس تصویر کو ہم کسی صورت میں فراموش نہیں کر سکتے۔ جب بھیم کے روکنے کے باوجود کنتی نے جنگل جانا پسند کیا اور یہ کہا کہ میں نے زندگی کی سینکڑوں نعمتوں کو اپنے شوہر کے ساتھ حاصل کیا ہے۔ زندگی کے خوبصورت پہلوؤں پر نظر رکھی ہے۔ میں نے تمہیں لڑنے پر صرف اسلئے مجبور کیا تھا کہ تم لوگ کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلاؤ۔ کنتی کے کردار میں مہابھارت کی ایک للکار، ایک بجلی اور ایک چمک پوشیدہ ہے۔ مہابھارت کی عظمت کو سمجھنے کے لئے ہمیں کنتی کے کردار کا بہت سہارا لینا پڑتا ہے۔ وہ نئی نسل میں ایک زندگی دیکھنا چاہتی ہے۔ ٹھیک اور مناسب باتوں پر اعتبار کرنے کو کہتی ہے اور ذہن میں وسعت چاہتی ہے۔ مہابھارت میں عورتوں کی فطرت کی

بھی سچی تصویریں موجود ہیں مہا بھارت کے دیوتا انسان کی زندگی سے دلچسپی ضرور لیتے ہیں لیکن کبھی ان کے کام میں زیادہ دخل دینے کی کوشش نہیں کرتے۔ ویاس کی شکنتلا کالیداس کی شکنتلا کی طرح نازک اور الجھنوں میں گرفتار نہیں بلکہ عورت کی عظمت کا اسے احساس ہے۔ وہ ایک بیباک اور نڈر لڑکی ہے۔ سچائی کے لئے شوہر اور بچے کی قربانی کو جائز سمجھتی ہے۔ اسکے کردار میں بیباکی اور بانکپن ہے۔ مہا بھارت کے مکالموں میں عجیب جادو ہے ادی یارد اور دریودھن کی گفتگو کرن، ارجن اور بھیم کی وہ باتیں جو اپنے فن تیر اندازی کے لئے ہوتی ہیں، یودھشٹر، بھیم اور دروپدی کی گفتگو۔ امن قائم رکھنے کے لئے۔ کرشن کی کوروں کے سامنے تقریر اور پھر کرشن کی وہ تقریریں جو ارجن کو کرن سے جنگ کرنے کے لئے مجبور کرتی ہیں۔ مکالموں کی لاتعداد خصوصیتوں کو ہمارے سامنے پیش کر دیتی ہیں۔ مکالموں میں بیباختگی چٹیلاپن، زور، بے باکی، نفسیاتی رنگ دروپ ہے، کسی بات کو اچھی طرح سمجھانے کی قوت، کردار کی اہمیت اور خصوصیت کو ابھارنے کی طاقت سچائی، سادگی، وقار، خودداری، نصب العین کو حاصل کرنے کی جدوجہد۔ یہ ساری باتیں موجود ہیں ہے اور ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ڈرامائی کیفیتوں کا سہارا لیکر مہا بھارت کو دنیا کی ایک نہایت ہی عظیم تخلیق بنانے کی کوشش ایک کامیاب کوشش ہے۔

فطرت کی عکاسی بھی اچھے ڈھنگ سے کی گئی ہے۔ ہمالیہ کی تصویر کشی جس طرح ہوئی ہے۔ اس سے یہی محسوس ہوتا ہے کہ اس کیلئے ہمالیہ کو دیکھا گیا ہے۔ ہمالیہ کی برف کی تعریف میں جو باتیں کی گئی ہیں وہ حقیقی ہیں۔ عورت کے حسن کی تعریف میں بھی احتیاط سے کام لیا گیا ہے

دروپدی کے حسن کی تعریف جس طرح کی گئی ہے۔ اس میں بہت سادگی ہے ایک جگہ کہا گیا ہے کہ دروپدی زیادہ لمبی ہے اور نہ زیادہ چھوٹی۔ زیادہ دبلی ہے اور نہ زیادہ موٹی۔ اسکی آنکھیں بڑی ہیں۔ اسکی سانسوں میں کنول کے پھولوں کی خوشبو ہے۔ اس قسم کی باتیں مختلف جگہوں پر ملتی ہیں۔ مہابھارت میں جو موضوع ہے۔ اس میں بڑی وسعت ہے۔ اس کی فضا میں نئی کیفیتیں ہیں۔ سماج کی مکمل عکاسی موجود ہے۔ ایک ہیرو کی زندگی کی پوری داستان ہے۔ وہ ساری باتیں موجود ہیں جو ایک ایپک میں ضروری ہیں اگر مہابھارت کی کہانی حقیقی نہیں ہے تو یہ سوچا نہیں جا سکتا کہ اسکی تخلیق میں ذہن نے کتنی دور پرواز کیا ہے۔ تخیل کی دنیا سے واقعی اس سے اعلیٰ اور بہتر تحفہ نہیں لایا جا سکتا تھا۔ شاعرانہ مبالغہ آرائی اور مذہبی جوش عقیدت اور صدیوں بھاٹوں کی مبالغہ آمیز نغمہ سرائی کے باوجود مہابھارت انسان کی ایک اعلیٰ تخلیق ہے اور اسکی مدد کے بغیر انسان کی ابتدائی زندگی کلچر اور زبان کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ اسکی اگر کوئی تاریخی اہمیت ختم ہو گئی ہے تو اسکی اپنی ایک تاریخی اہمیت بھی ہو گئی ہے

مہابھارت کی زبان کے متعلق یہ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایپک زبان ہے۔ اسکی سادگی، گہرائی اور بلندی جو خصوصیتیں دیتی ہیں ان سے زبان کے حسن کا اندازہ ہوتا ہے۔ اندازِ بیان میں جادو ہے اظہار کا وقار ہے۔ آواز کی ہم آہنگی، الفاظ کا رکھ رکھاؤ اور خیالات کو تمام نزاکتوں کے ساتھ پیش کر دینے کے لئے جملوں کی تراش و خراش دیکھکر حیرت ہوتی ہے۔ ایک ماہر زبان سے جو امیدیں کیجا سکتی ہیں وہ سب مہابھارت میں پوری ہو گئی ہیں۔ اسکی زبان میں جو پاکیزگی ہے وہ سنسکرت

کی کسی تخلیق میں اتنی صفائی کے ساتھ پیش نہیں ہوئی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مہابھارت کی زبان کے حسن کو سمجھنے کے لئے بھگوت گیتا کا مطالعہ ضروری ہے۔ بھگوت گیتا کے فلسفوں میں سنسکرت زبان کا تمام حسن سمٹ آیا ہے۔ مہابھارت میں ادیا جاتی اور انشتپ بحریں استعمال کی گئی ہیں (سنسکرت میں جو ایپک کی خاص بحریں سمجھی جاتی ہیں) بعض ماہرین یہ درست کہتے ہیں کہ اس ایپک میں لڑائیوں کا جو بیان ہے اس میں یکسانیت ہے اور تھکا دینے کا انداز ہے۔ اس بیان سے بعض وقت طبیعت بوجھل ہو جاتی ہے۔ مہابھارت کا موضوع ایک ہے اور اس موضوع میں بڑی وسعت بھی ہے لیکن کسی ایک خاص جذبہ کی لہریں تمام نہیں ہیں۔ اسکی وجہ ظاہر ہے۔ اس عظیم تخلیق کی ذمہ داری ویاس کے علاوہ وشام پائن اور سوتی پر بھی آتی ہے۔ مختلف مزاج، مختلف طبیعت، مختلف ماحول اور انداز نے جہاں موضوع میں وسعت دی وہاں جذبہ کی بہت ساری لہروں کو یکجا کر دیا۔ ویاس کی زبان میں جو سادگی اور رس ہے۔ اسمیں عوام کی بولیوں کا رنگ ملتا ہے۔ ویدک زبان کا گہرا اثر ویاس کی زبان پر دیکھا جا سکتا ہے۔ سنسکرت شاعری کی اعلیٰ نزاکتوں کو بھی یہاں دیکھا جا سکتا ہے۔ سوتی نے ویاس کے دئے ہوئے دلفریب عناصر سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھایا ورنہ مہابھارت کی کچھ وہ خصوصیتیں شروع میں نظر آتی ہیں بعد میں قائم رہجاتیں۔ اور ان سے اس ایپک میں اور زیادہ شان پیدا ہو جاتی۔

مہابھارت سے اسکا پتہ صاف طور پر چلایا جا سکتا ہے کہ آریوں کی تہذیب کافی آگے بڑھ گئی تھی اور اس تہذیب میں ایک خاص قسم کا نکھار پیدا ہو گیا تھا۔ بادشاہوں، فوجیوں، قلعوں اور باغوں کے

متعلق جو کچھ کہا گیا ہے ان میں ایک ترقی یافتہ تہذیب کی مکمل تصویر ہے
قربانیاں دی جاتی تھیں، مویشی پالے جاتے تھے۔ شکار کھیلے جاتے تھے۔
قبیلوں کے سردار راجے کہلاتے تھے۔ دریاؤں کے کنارے چراگاہیں تھیں
مختلف چراگاہوں پر مختلف قبیلوں کا قبضہ تھا۔ زراعت نے ترقی
کی تھی۔ مہابھارت کی لڑائی کے وقت گنگا کے کنارے ہستناپور اور
جمنا کے کنارے اور اندر پرستھ یعنی قدیم دہلی تک آریوں کی نوآبادیاں
پھیلی ہوئی تھیں۔ متھرا سے دوارکا تک بھی ان کے اثرات پھیل رہے
تھے۔ شاہنامہ فردوسی پر مہابھارت کے گہرے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں
رستم اور سہراب کی داستان میں جو ہتھیار نظر آتے ہیں وہ وہی ہیں
جو مہابھارت میں ہیں۔ جنگ کے اصول اور قاعدے بھی وہی ہیں۔

میں وبیر (Weber) کے اس خیال سے متفق نہیں ہوں کہ
مہابھارت کی تخلیق میگھاستھنیز (Megasthenese) کے بعد ہوئی
ہے۔ وبیر کا خیال ہے اگر میگاستھنیز کے قبل مہابھارت کی تخلیق ہوئی ہوتی
تو وہ اسکا ذکر ضرور کرتا۔ اس نے اس عظیم ایپک کے متعلق کچھ نہیں کہا ہے
وبیر نے ہندوستان کی قدیم زندگی کو جس طرح تدیافت کیا ہے اسے
دیکھکر حیرت ہوتی ہے۔ اس کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس نے بہت ساری
باتیں کچھ عجیب طریقے سے پیش کی ہیں۔ ہمیں یہ فراموش نہیں کرنا چاہیئے
کہ میگاستھنیز نے جو کچھ لکھا ہے وہ ہمارے سامنے نہیں ہے۔ اسکی وہ
اہم کتاب ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ وہ کتاب گم ہو چکی ہے اور
ہم اسکی یاد کر کے ہمیشہ افسوس کریں گے۔ تین سو سال قبل مسیح ہندوستان
کی جو حالت تھی اسکے متعلق میگاستھنیز نے جو لکھا تھا۔ اسے مختلف ماہرین

نے مختلف ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ اس طرح بہت ہی کم باتیں ہمارے سامنے آئی ہیں۔ ہم تین سو برس قبل مسیح کے ہندوستان کو اسکی اپنی صورت اور رنگ وروپ میں ابھی تک صحیح معنوں میں نہیں دیکھ سکے ہیں۔ ویبر نے مہابھارت کی تخلیق کا جو وقت بتایا ہے وہ ایک اتنی عظیم تخلیق کے لئے بہت کم ہے۔ اتنے کم عرصہ میں مہابھارت کی تخلیق ممکن نہیں۔ یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ مہابھارت پر سوتی نے جو کام کیا ہے۔ اسکا عرصہ یا وقت یہی ہو لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ اتنے کم وقت میں مہابھارت کی ابتدا بھی ہوئی ہو اور اسے ختم بھی کیا گیا ہو دکن میں تو مہابھارت کے لاکھوں اشعار سے لوگ میگاستھنیز کے قبل بھی واقف تھے۔

بھگوت گیتا کو تمام ویدوں کا نغمہ کہا گیا ہے۔ جنگ سے قبل ارجن نے لڑنے سے اسلئے انکار کیا۔ کہ ان کے ہاتھوں سے اپنے لوگوں کا قتل ہوگا۔ کرشن نے ارجن کو یہ بتایا۔ کہ انسان کی روح ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ جسم کے ختم ہو جانے سے انسان کی زندگی کا تسلسل ختم نہیں ہوتا۔ اس طرح گفتگو کی ابتدا ہوتی ہے اور زندگی کے ہر پہلو پر باتیں ہوتی ہیں اٹھارہ باب ایسی باتوں سے پُر ہیں۔ گفتگو میں اخلاقی، مذہبی، جسمانی اور روحانی زندگی کے متعلق مختلف سوالات ابھرتے ہیں۔ قربانی کے اصولوں پر باتیں ہوتی ہیں۔ مادی زندگی اور روحانی قوتوں کی اہمیت کو واضح کیا جاتا ہے۔ عبادت کے صحیح مقام پر گہری نظر رکھی جاتی ہے۔ امن اور تجارت کی اہمیت سمجھی جاتی ہے۔ کرشن کی باتوں کو قبول کرکے تمام طبقوں کی زندگی میں ایک نئی [illegible] پیدا ہو جاتی ہے۔ اپنشاد کے بعض خیالات کی تکمیل بھگوت گیتا میں ہوتی ہے۔ [illegible] ستانیوں کے خیالات کے تسلسل پر اس طرح غور

کیا جاسکتا ہے۔ اپنشاد سے بھگوت گیتا تک بہت سی روایتیں آگے بڑھی ہیں۔ بہت ساری کمی پوری ہوئی ہے۔ سوچنے کے ڈھنگ میں ایک خاص انداز پیدا ہوا ہے۔ خیالوں میں صفائی، پاکیزگی اور نفاست آئی ہے بھگوت گیتا میں ایک خاص پیغام ملتا ہے اور وہ ہے بھگتی پر یقین۔ اسکی زبان میں ایک جادو ہے۔ جملوں کی تراش وخراش اور ترتیب میں ایک خاص حسن ہے۔ لہجہ میں نرمی اور گداز ہے۔ پیغام میں دل میں اتر جانے والی کیفیت ہے۔ ہندوستانی فلسفہ اور زبان کا مطالعہ بھگوت گیتا کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ بھگوت گیتا کے وسیع دائرہ میں حیات کے سینکڑوں پہلو اُجاگر ہو گئے ہیں۔ اندھے راجہ کو لڑائیوں کو دیکھنے کے لئے جب آنکھیں دیجاتی ہیں تو وہ آنکھوں کی روشنی سے انکار کرتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ وہ اپنی آنکھوں سے انسانوں کا لہو دیکھے۔ ارجن یہ سوچتے ہیں کہ وہ لڑائی کر کے ایک فاش غلطی کریں گے۔ اس لئے کہ روح کو ختم نہیں کیا جاسکتا۔ تلوار اور آگ ہوا اور پانی سے انسان ختم نہیں ہو سکتا۔ کرشن ایک فلسفی اور رہنما کی طرح آتے ہیں۔ بھگوت گیتا کا پیغام سامنے آتا ہے۔ عملی جدوجہد میں اپنے مطلب سے دور رہنا۔ اپنے کام میں اپنی خودی کو فراموش نہ کرنا۔ عمل کو سب کچھ سمجھ کر نتیجے پر غور نہیں کرنا۔ نجات کے لئے جدوجہد کرنا۔ یہ ساری باتیں نہایت ہی خوبصورت اور انوکھے ڈھنگ سے سامنے آتی ہیں۔ بھگوت گیتا کے پیغام کو اسکے اپنے خیالات کی روشنی میں سمجھا جاسکتا ہے۔ اس کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ اسکا پیغام آج بھی ہمیں ہر مقام پر للکار رہا ہے اور اپنی طرف متوجہ کر رہا ہے۔ ارجن کے غم میں اجتماعی غم کا تمام درد سمٹ آیا ہے۔ پہلا باب ہمیں اس سلسلہ میں بہت کچھ سوچنے پر مجبور

کرتا ہے۔ ارجن کو اس طرح بولتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔

"اے کرشن اپنے ان عزیزوں کو دیکھکر جو آج لڑنے کے لئے آئے ہیں۔ میری آواز بند ہے۔ میرے جسم میں تھرتھری سی آگئی ہے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہیں۔" میری کمان ہاتھ سے گر رہی ہے۔ میرے جسم میں ایک آگ سی لگ رہی ہے۔ دوسری جگہ کہتے ہیں:۔ "اے کرشن اپنے لوگوں کے قتل میں مجھے کوئی لطف نہیں ملیگا۔ میں فتح کا خواہشمند نہیں ہوں۔ اور مسرتوں کو بھی نہیں چاہتا۔ استاد چچا لڑکے، پوتے، دادا، سسر، سب لڑائی کے لئے کھڑے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کے لئے زندگی اور دولت انسان چاہتا ہے۔ جب یہ لوگ نہ رہیں گے پھر حکومت، مسرت اور زندگی کی کیا ضرورت ہے"۔ سنجایا نے کہا کہ اس قسم کی باتوں کے بعد جنگ کے میدان میں رتھ پر ارجن نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ اس وقت نہ ان کے ہاتھوں میں تیر تھا اور نہ کمان ان کا دماغ غم سے بوجھل ہو رہا تھا۔ "عقل کی راہ" بھگوت گیتا کا دوسرا باب ہے۔ جہاں کرشن ارجن کو سمجھاتے ہیں۔ عقل، دماغ، غم، غصہ، ذہانت، جذبہ احساس، گناہ، آزادی، عمل، خودی، قربانی، غذا، سچائی، علم ساری باتوں پر اظہار خیال ہوتا ہے اور زندگی کے بہت سارے حقائق کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔ بھگوت گیتا کا تیسرا باب "عمل کی راہ" ہے۔ تیسرے اور باقی حصوں میں سنسکرت زبان کی صفائی اور نکھار کو دیکھا جا سکتا ہے۔ مہابھارت کی بہت ساری کمزوریاں بھگوت گیتا میں دور ہو گئی ہیں اور ساری باتوں میں جان سی آگئی ہے۔ موضوع اور زبان دونوں کی عظمت کا یہاں گہرا احساس ہوتا ہے

جہاں تک موضوع اور انداز بیان کا تعلق ہے۔ رامائن اور مہابھارت

میں بہت فرق ہے - رامائن میں ایک انفرادیت ہے جو ہر جگہ نمایاں ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ایک ہی دماغ اور ایک ہی قلم ہر جگہ موجود ہے — جہا بھارت میں گرائمر کی بہت ساری غلطیاں ملتی ہیں۔ لیکن رامائن میں یہ بات نہیں ہے - اس میں زبان کی غلطیاں نہیں ہیں - صفائی، نفاست اور حسن کو رامائن میں دیکھا جا سکتا ہے - ایپک کا ڈرامائی رنگ و روپ اس میں جہا بھارت سے زیادہ ہے - رامائن کے سات حصے ہیں اور ان میں ۲۴،۰۰۰ (چوبیس ہزار) اشعار ہیں - رام چندر جی کی پیدائش ان کی جوانی، ان کی شادی اور جنگل میں زندگی گزارنے کی داستان ہے اور پھر راون کے ساتھ جنگ، راون کی موت اور سیتا کے ساتھ اجودھیا لوٹ آنے کی کہانی ہے - رامائن جہا بھارت کے بعد کی تخلیق ہے - بعض ماہرین نے رامائن کو جہا بھارت کے پہلے کی تخلیق بتا کر خواہ مخواہ حقیقتوں کو الجھانے کی کوشش کی ہے۔ وادی گنگا میں مشرق کی طرف آریہ بڑھ چکے تھے - نئی ریاستیں قائم ہو گئی تھیں - نئے شہر بسائے گئے تھے - اس وقت کے باغات اور محلوں کے حالات سے اس زمانہ کے لوگوں کے جمالیاتی شعور کا بھی پتہ چلتا ہے - ہندوستانیوں کی زندگی میں کافی تبدیلی آ گئی تھی - برہمنوں کے اثرات بڑھ گئے تھے - تعلیم پر کافی توجہ دی جا رہی تھی - راجہ دسرتھ کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ وید دں کا عالم تھا راون کو بھی ایک بڑا عالم کہا گیا ہے - لنکا کا جو کلچر ہمارے سامنے رامائن کے ذریعہ آتا ہے - اس سے یہی محسوس ہوتا ہے کہ وہاں بھی زندگی کافی ترقی کر چکی تھی - اجودھیا کے تمدن سے لنکا کا تمدن کسی طرح کم نہ تھا - کچھ ماہرین رامائن اور ہیلن آف ٹرائے کا مقابلہ کرتے ہوئے یہ کہتے

ہیں کہ ہیلن کی عصمت لٹ گئی اور اسکے باوجود اسکے شوہر نے اسے عزیز رکھا اور سیتا کو اپنی عصمت کے محفوظ رہنے کا لوگوں کو یقین دلانا پڑا۔ اسلئے ہیلن سیتا سے زیادہ اہم ہو جاتی ہے۔ یہ ماہرین اس پر غور کرتے ہیں کہ دونوں کردار دو مختلف ماحول، مختلف ادوار اور دو مختلف ممالک کے پیداوار ہیں۔ جذبات اور افکار میں کتنا فرق ہے۔ دونوں کردار سے دو مختلف ملکوں کے کلچر کو کس طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ سوچنے کے ڈھنگ میں کیا فرق تھا کون سی حقیقت زیادہ ترقی پسند تھی۔ اس کا فیصلہ کرتے ہوئے ہمیں آج کی دنیا اور آج کے معیار کو پیش نظر نہیں رکھنا ہے بلکہ ماضی کے واقعات اور سماجی حقیقتوں کو کنگھالنا ہے۔ رامائن سے ہندوستان کی عظمت کا اور گہرا احساس ہوتا ہے۔ ہندوستان کی عزت دل میں اپنا ایک مقام حاصل کر لیتی ہے۔ رامائن میں قدیم ہندوستانی زندگی کے خیالات، تصورات، اصول، رسومات، فضا، ماحول، جدوجہد کے طریقوں کو اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کے عوام کو سمجھنے اور ہندوستانی شعور کا تجزیہ کرنے کے لئے اور ہندوستان کی پروازِ تخیل کو سمجھنے کے لئے رامائن کا سہارا لینا ضروری ہے۔ اس میں انسانی جذبات کی عکاسی ہر جگہ موجود ہے۔ انسان کے جذبات کی تمام نزاکتیں عیاں ہیں۔ جذبات کو اتنے بھرپور طریقے سے اب تک دنیا کے کسی ادب میں نہیں دیکھا گیا ہے۔

ویدوں کی صحیح سپرٹ کو سمجھنے کے لئے رامائن کا مطالعہ بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ ہندوستان کے کلچر کی تاریخ کا ایک سلسلہ ہے ہم رامائن کے مطالعہ سے قدیم ترین زندگی پر بھی اچھی خاصی روشنی

پڑتی ہے۔ ویدک اور کلاسیکی دور کے درمیان رامائن ایک کڑی ہے روایت کے سلسلوں کو اس کے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا ہے۔ ہندوستانی عوام کی زندگی پر ہزاروں برس سے اسکے اثرات پھیلے آرہے ہیں۔ اس سے اپنے ماضی کو بھی سمجھنے میں آسانی ہوئی ہے اور موجودہ زندگی میں سنبھل سنبھل کر قدم اٹھانے میں بھی ہمیں سہولتیں ملی ہیں۔ کلاسیکی شاعروں اور ڈرامہ نگاروں پر رامائن کے گہرے اثرات پڑے ہیں۔ اس اپیک کی بنیاد کی تلاش ویدوں میں ہوتی رہی ہے۔ اولڈن برگ (oldenberg) نے مکالموں کے سلسلے میں اس قسم کی تحقیق کی ہے اور یہ بتایا ہے۔ کہ رامائن کے مکالموں کی بنیاد رگ وید کے منتروں میں ہے۔ ہندوستانی اپیک کی قدیم صورت نثر اور نظم دونوں موجود ہیں۔ لیوی (Levi) اور میکس مولر (Max Müller) نے اولڈن برگ کے خیالات سے شدید اختلاف کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس قسم کے منتروں کا تعلق ڈرامہ سے ہے۔ ممکن ہے یہ بھی ایک قسم کا ڈرامہ ہو۔ ہرٹل (Hertel) نے بھی اس خیال کی تائید کی ہے۔ اور کہا ہے کہ اسکا تعلق مذہبی ڈراموں سے ہے۔ ونٹرنٹز (Winternitz) نے ان سے صاف طور پر اختلاف کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ قدیم گیت ہیں اور اپیک اور ڈرامہ نہیں ہیں۔

مہابھارت کی طرح رامائن میں بھی کچھ نہ کچھ تبدیلیاں ہر دور میں ہوتی رہی ہیں اور اسطرح اب تک بہت ساری تبدیلیاں ہو چکی ہیں۔ رامائن میں کسی قسم کی تبدیلی کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ والمیکی کو اس کا خالق قبول کر لیا گیا ہے۔ ان باتوں پر غور کرتے ہوئے ہمیں یہ بھی

فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔ کہ رامائن کی باتیں شروع میں زبانی ایک دوسرے تک پہنچتی رہی ہیں۔ اس میں مشرق کے آریوں کی سادہ زندگی کو بھرپور طریقہ سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اس وقت لوگوں کو جنگ سے دلچسپی نہیں تھی۔ اور نہ وہ جنگ کی چالبازیوں سے واقف تھے۔ راون سے لڑائی کا جو حال ہے اسمیں جنگ کی وہ کیفیت نہیں ہے جو مہابھارت میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ماہرین اس حقیقت کی روشنی میں بھی یہ پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ رامائن مہابھارت کے قبل کی تخلیق ہے۔ اس روشنی میں سوچتے ہوئے یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ مہابھارت میں انسان عملی زندگی کو جس طرح دیکھ رہا ہے۔ اس طرح رامائن میں اسکی نگاہیں پریشان نہیں ہیں۔ رامائن میں بلند خیالات اور تصورات پیدا ہو گئے ہیں۔ خیالات اور تصورات کی یہ بلندی مہابھارت میں نہیں ہے اور نہ اس وقت پیدا ہو سکتی تھی۔ مہابھارت میں زندگی کے جو اصول پیش کئے گئے ہیں دراصل انہیں کی بنیاد پر رامائن کے بلند اور اعلیٰ خیالات، تصورات اور اصولوں کی عمارت اٹھائی جا سکتی ہے جس حقیقت کی ابتدا مہابھارت میں ہے۔ اسکی انتہا رامائن میں ہے۔ صرف چند باتوں کو پیش نظر رکھکر رامائن کو مہابھارت کے قبل کی تخلیق بتانا دینا مناسب نہیں ہے۔ اور وہ چند باتیں بھی جب زیادہ اہم نہ ہوں مہابھارت کے کردار رامائن کے کردار نہیں ہیں یعنی وہ انسان کی کسی خاص فطرت یا نفسیات کی نمائندگی نہیں کرتے۔ مقدس کردار ہیں لیکن ان میں ہیرو بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔ انسانی زندگی، فطرت اور نفسیات کی نمائندگی کے لئے ہیرو بنانا پڑتا ہے۔ تاکہ خاص پہلوؤں پر بھرپور

طریقہ سے روشنی پڑے۔ انہیں کرداروں کی فطرت لیکر رامائن میں کچھ کرداروں کو نمائندہ بنایا گیا ہے۔ وہاں انسان ہیں اور یہاں انسان کے نمائندے ہیں اور اس نمائندگی کے لئے ضروری ہے کہ اس کا پس منظر اچھی طرح تیار ہو۔ مہابھارت رامائن کا پس منظر بن جاتا ہے۔ اسکی مدد کے بغیر سلسلہ اتنی دور تک نہیں آسکتا تھا۔ دونوں ایپک سے ہندوستانی کلچر میں تبدیلیوں کو سمجھا جاسکتا ہے۔ ہندوستانیوں کے خیالات کی رفتار اور بہاؤ کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔ میک ڈونل (Macdonell) نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھا ہے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ دنیا کے تمام ادب میں اسکی مثال نہیں ملتی کہ کوئی ایپک یا کوئی تخلیق عوام کی زندگی اور خیالات کو اتنے بھرپور طریقہ سے متاثر کرتی رہی ہو زندگی اور خیالات میں تبدیلیاں لاتی رہی ہو اور سوچنے کے ڈھنگ میں توازن پیدا کرتی رہی ہے۔ رامائن نے عوام کی زندگی اور خیالات اور سوچنے کے ڈھنگ پر جو اثر ڈالا ہے۔ اسکے مقابلہ میں دنیا کی کوئی تخلیق سامنے نہیں لائی جاسکتی ہے۔

رامائن کے تنقیدی مطالعہ کے وقت ہم لاسن (Lassen) کو کبھی اور کسی صورت میں فراموش نہیں کر سکتے۔ لاسن پہلا مصنف ہے جس نے رامائن کے مسئلوں کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ اسکی کہانی کے ارتقاء پر اس نے پہلی بار اچھی طرح روشنی ڈالی۔ اس نے اس سلسلہ میں بہت ساری دلچسپ باتیں کی ہیں۔ اپنی مشہور اور معروف کتاب (Indische Alterthumskunde) میں اسنے تاریخی نقطہ نظر سے کچھ ایسی باتیں اجاگر کی ہیں جس پر بہت سارے ماہرین کو ایمان لانا پڑا۔ ویبر مونیر ولیم، موئر اور فرانڈریچ نے لاسن کے خیالات کی حمایت کی اور ایک ایسی فضا تیار ہو گئی کہ لوگ انہیں کی نگاہ سے رامائن کو دیکھنے لگے۔ گلسن

نے کہا تھا کہ رام ان آریہ قبیلوں کا نمائندہ تھے جو قبیلے دکن کی طرف اپنی تہذیبی عناصر کے ساتھ بڑھے تھے۔ عوام کے کردار میں ایک قوم کی زندگی اور ایک قوم کی جد و جہد ہے۔ آریاؤں نے دکن میں جاکر جو کچھ کیا اسکی مکمل تصویر رامائن میں موجود ہے۔ اس طرح رامائن کی ایک بڑی تاریخی حیثیت ہو جاتی ہے ویبر نے لاسن کی حمایت ضرور کی لیکن اس حقیقت پر زور دیکر اس نے بڑی تنگ نظری پیدا کر لی۔ کہ والمیکی کے یہاں وہی تمام ساری باتیں جو ہومر (Homer) کے یہاں ہے اس نے اس سلسلہ میں جو مثالیں دی ہیں وہ انتہائی مضحکہ خیز ہیں۔ اس کی تنگ نظری سے کافی نقصان ہوا۔ بہت سارے لوگ اس نظریہ کے عرصہ تک شکار رہے۔ ویبر کے نقطہ نظر اور نظریہ پر سخت تنقیدیں ہوئی ہیں۔ جیکوبی اور ھاپکنس نے ویبر کے خیالات پر سخت نکتہ چینی کی اور اسکی تنگ نظری کا مذاق اڑایا ہے۔ ویبر کا یہ خیال ہے کہ رامائن میں ان واقعات کا ذکر ہے جو دکن اور لنکا میں آریوں کے بڑھنے کی وجہ سے رونما ہوئے تھے۔ آریہ کلچر کس طرح دکن اور قبیلوں میں پھیلا اسکی تاریخ کو محفوظ رکھنے کے لئے رامائن کی تخلیق ہوئی تھی۔ جیکوبی نے اپنی کتاب (Das Ramayana) میں اس موضوع پر بہت اچھی بحث کی ہے۔ رامائن کے موضوع اور کہانی کے ارتقاء پر بھی کافی اچھی روشنی پڑتی ہے۔ رامائن کی بنیاد ابتدا اور ارتقاء بدھ ازم اور یونانی اثرات رامائن کا زمانہ اور شاعرانہ نزاکتوں پر جیکوبی نے کافی اچھی روشنی ڈالی ہے اب تک اتنے بھرپور طریقہ سے رامائن پر صحیح معنوں میں کام نہیں ہوا ہے جیکوبی کے خیالات کی تائید ان ایچ ورٹز ([illegible]) نے کی ہے جو اسکا ناقد بھی تھا۔ اس نے اس حقیقت کا بھی انکشاف کیا ہے کہ مغربی ماہرین

نے رامائن پر جو کچھ کام کیا ہے اسکی بنیاد رامائن کا گجراتی وہ مسودہ ہے
جو دس سال نیپول کے وقت لکھا گیا تھا۔ اس انکشاف سے کچھ باتیں اور
صاف ہو جاتی ہیں اور خصوصاً جیکولی نے جو کچھ سمجھا اور سمجھایا ہے اسکے
متعلق ہمیں بہت ساری باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ ایچ۔ ورنز کی کتاب
Die westliche Rezension des Ramayana
کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔

ایچ جیکولی کا خیال ہے کہ لسانیاتی بنیاد پر ایپک کی بنیاد کا
وقت بدھ کے پہلے ہے۔ مہابھارت اور رامائن کی زبان وہ سنسکرت
ہے جو عوامی ہے۔ یعنی اس وقت عام لوگ اس زبان سے اچھی طرح
واقف تھے۔ ۲۶۰ برس قبل مسیح اشوک نے عوام سے کچھ کہنے کے لئے
جس بولی کا انتخاب کیا تھا۔ وہ پالی سے ملتی جلتی تھی۔ لیکن سنسکرت نہیں تھی
گوتم بدھ نے چھٹی صدی قبل مسیح کے شروع میں جس زبان میں اپنے خیالات
کا اظہار کیا وہ زبان بھی سنسکرت نہیں بلکہ وہ زبان تھی جو عوام میں مقبول
تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب سنسکرت کی ہردلعزیزی ختم ہو چکی تھی۔ مہابھارت
اور رامائن کی زبان سنسکرت ہے اور ظاہر ہے یہ سنسکرت اپنے وقت میں
عوام میں ضرور مقبول ہوگی۔ ایپک کے لئے جس زبان کا انتخاب کیا گیا وہ زبان
ایک زندہ زبان ہوگی لہذا اس وقت ایپک کی تخلیق کے متعلق سوچنے
سے کیا حاصل جب اسکی زبان عوام میں مقبول نہ ہو۔ گوتم بدھ اور اشوک
کے وقت میں سنسکرت کی وہ حیثیت نہیں تھی جو ایپک کی زبان کو دیکھنے
اس لئے ہم اسکے وقت کی سنسکرت کی حیثیت کے متعلق سوچتے ہیں۔
مہابھارت اور رامائن کی تخلیق ظاہر ہے اسی وقت ہوئی ہوگی جب

سنسکرت ایک ہر دلعزیز زبان ہوگی اور عوام میں مقبول ہوگی - ایک زندہ زبان ایپک کی تمام نزاکتوں کو قائم رکھ سکتی ہے اور اسے ہمیشہ زندہ رکھ سکتی ہے - بدھ اور اشوک کے بعد مہابھارت اور رامائن کی تخلیق کے متعلق سوچنا واقعی نہایت ہی عجیب بات ہوگی - ایچ جیکوبی نے اس سلسلہ میں اچھی بحث کی ہے - کچھ ماہرین کہتے ہیں کہ مہابھارت اور رامائن کی تخلیق پہلے مختلف عوامی بولیوں میں ہوئی تھی - اور سنسکرت میں ان کے ترجمے ہوئے تھے - اس قسم کی بات بھی عجیب ہے - اتنی بڑی تخلیق کے ترجمے ہوں اور اسکا کوئی ریکارڈ نہ رکھا جائے اور ہمیں اسکا بھی علم نہ ہو کہ یہ ترجمے کب ہوئے اور کیسے ہوئے ؟ کہیں نہ کہیں تو اس سلسلہ میں کچھ باتیں ضرور مل جاتیں مہابھارت اور رامائن کے جو ترجمے دوسری بولیوں اور زبانوں میں ہوئے ہیں ان میں ترجمہ کی تمام کیفیت موجود ہے لیکن مہابھارت اور رامائن کی زبان پر ترجمہ کی کوئی کیفیت کہیں نظر نہیں آتی - مشہور بودھی شاعر آسوا گوش کی رزمیہ نظم بدھ کاریتا کی تخلیق کے پس منظر میں رامائن کا سارا رنگ و روپ موجود ہے - والمیکی کی شاعرانہ خصوصیتیں اچھی طرح نمایاں ہیں - آسوا گوش کے فن میں اتنی زندگی اور اتنا توازن پیدا نہیں ہو سکتا تھا اگر اس نے والمیکی کے رامائن کا مطالعہ نہ کیا ہوتا - چین میں سب سے پہلے رام کی جو کہانی ملتی ہے اس پر بدھ ازم کا گہرا رنگ ہے - رام کے کردار کو جس طرح وہاں پہلی بار پیش کیا گیا ہے - اس سے یہی محسوس ہوتا ہے کہ اسکی کوشش کی گئی تھی - کہ بدھ ازم کی اشاعت میں اس سے بھی کافی مدد لی جائے - چین میں آہستہ آہستہ رامائن کی مقبولیت بڑھتی گئی - ہندوستان میں اس وقت تک فلسفہ اور ادب پر رامائن کے گہرے اثرات پڑ چکے تھے -

چھ سو عیسوی میں کمبوڈیا میں رامائن کی کافی مقبولیت تھی۔ وہاں کے ایک مندر میں کسی نے رامائن پیش کیا تھا اور اسکے بعد ایک مقدس مذہبی کتاب کی حیثیت سے رامائن کی کافی اہمیت ہوگئی۔ ہندوستان میں مشہور بدھ فلسفی واسابندو کے وقت میں رامائن ایک نہایت ہی مقبول نظم سمجھی گئی ہے۔ مشہور جین ادیب ویملاسوری نے رامائن کی کہانی کو پراکرت میں پیش کیا اور اپنی مشہور نظم پدماکاریتا میں جین مذہب اور فلسفہ کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے رام کے کردار کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ والمیکی کا انداز اور خیال ویملاسوری کے یہاں موجود ہے۔ اس سلسلہ میں ایک اور اہم بات یہ ہے کہ رامائن پر بدھ ازم کا کوئی اثر نہیں ہے کچھ ماہرین رام کے کردار پہ بدھ ازم کا اثر دیکھتے ہیں۔ اس طرح بدھ ازم کی کچھ بنیادی باتوں کو ہر جگہ دیکھ سکتے ہیں اسلئے کہ ان کا تعلق زندگی اور حقیقت سے ہے۔ اس طرح باتیں کرکے ہم رامائن کی عظمت اور اہمیت سے آنکھیں چراتے ہیں۔ اسی طرح یونانی اثرات کی تلاش بھی عجیب سی بات ہے رامائن پر کہیں بھی یونانی اثر نظر نہیں آتا۔ رامائن کی خصوصیتوں پر نظر رکھنے والوں کو یونانی اثرات نظر نہیں آتے۔ ویبر نے ستیا اور ہیلن کا جسطرح مقابلہ کیا ہے وہ دلچسپ ضرور ہے لیکن کہیں بھی حقیقت نہیں ہے۔ لنکا اور ٹرائے کی مناسبت کی بات بھی حیرت میں ڈال دیتی ہے۔

اس میں اب کوئی شبہ نہیں ہے کہ رامائن کے دوسرے اور چوتھے حصوں کا پہلے اور ساتویں حصوں سے گہرا تعلق نہیں ہے۔ تخلیق کے عرصہ کا فرق ہے۔ آخری حصوں پر اگر کہیں بدھ ازم کی چھاپ ہے تو اس سے یہ سمجھنا مناسب نہیں ہے کہ رامائن کے ہر حصہ کی تخلیق بدھ ازم کے پھیلنے کے بعد ہوئی

ہے۔ والمیکی نے تیسری صدی قبل مسیح رامائن کی تخلیق کی تھی۔ ممکن ہے کہ اسکی بنیاد نہایت ہی قدیم گیتوں اور کہانیوں پر ہو۔

جے کیٹس (J. Kats) نے سماترا اور جاوا میں رامائن کے کرداروں کا مقابلہ بہت ہی دلچسپ کیا ہے۔ خاص کرداروں کے گہرے تعلقات پر بھی اچھی روشنی ڈالی ہے۔ اس سلسلہ میں بھی ماہرین متفق نظر آتے ہیں کہ جاوا میں کاکاوِن کے نام سے جو رامائن ہے دراصل وہ بھگتی کاویہ سے متاثر ہوکر لکھی گئی ہے۔ رامائن کے گہرے اثرات سماترا اور جاوا کے علاوہ بالی، کمبوڈیا سیام، تبت اور چین پر بھی پڑے ہیں۔ تبت میں رامائن کا اثر بالکل مختلف ہے ہندوستان کے رام کی کہانی وہاں اپنی اصلی حالت میں نہیں ہے۔ اس عظیم ایپک کے مختلف واقعات مختلف صورتوں میں دونوں ممالک میں ہیں تبت میں رامائن کی کہانی دیکھکر ایسا لگتا ہے جیسے اسکا تعلق والمیکی کی تخلیق سے براہ راست نہیں ہے۔ والمیکی سے قبل نیپال کے ذریعہ رام کی کہانی جس طرح وہاں پہنچی تھی رامائن میں پیش کی گئی ہے

چار سو پچاس برس قبل مسیح ہندوستان میں تحریر کی جو صورت ملتی ہے اسکا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ سیلاس (silas) نام کا جو ایک رسالہ موصول ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گوتم بدھ کے انتقال کے بہت پہلے یہ رسالہ موجود تھا۔ گوتم بدھ کے جو تیرہ مکالمے شریک ہوئے ہیں وہ بعد میں شریک کئے گئے ہیں۔ اس رسالہ میں بہت ساری باتیں ایسی ہیں جن کا تعلق بدھ ازم سے بالکل نہیں ہے۔ بچوں کے مختلف کھیلوں کی ایک فہرست بھی شامل ہے۔ "اگھا ریکا" نام کا بھی ایک کھیل ملتا ہے جس میں مختلف حرفوں سے بچے کھیلتے تھے۔ رائیس ڈیوڈس کا یہ خیال درست ہے کہ اس سے

یہ پتہ چلتاہے کہ علم حرف سے اس وقت لوگوں کو اتنی آگاہی ہو چکی تھی کہ اسکا تجزیہ کرکے انہوں نے بچوں کے کھیل میں بھی اسے شامل کیا تھا۔ ممکن ہے تعلیم کا یہ بھی کوئی ایسا پیارا طریقہ ہو جس پر آج ہم بھی محنت کر رہے ہیں فن تحریر کسی خاص طبقہ تک محدود نہیں تھا۔ عوام نے اس فن سے کافی فائدہ اٹھایا تھا۔ سرکاری کام سے لیکر ہر فرد کے تعلقات تک اس فن کی قدر کیجاتی تھی۔ اسوقت کے حالات سے پتہ چلتاہے کہ زندہ رہنے کے لئے فن تحریر کے بہت سارے انداز کو جاننا اور سمجھنا ضروری تھا۔ عورتوں میں بھی لکھنے کا شوق کافی تھا۔ عورتیں اپنے بچوں کو لکھنا سکھاتی تھیں۔ اور اس فن کا تجزیہ کرکے بچوں کے لئے کھیلوں میں بھی جان پیدا کر دیتی تھیں۔ تحریر کی مدد سے بچوں کے کھیل کے طریقوں میں اضافہ ہوا تھا۔ یہ کتنی بڑی بات تھی۔ اس سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہو جاتی ہے کہ اس سے صدیوں قبل ہندوستانیوں نے لکھنا شروع کیا تھا۔ اسکے بغیر سیلاس (صعلنی) کی تحریروں کی اہمیت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اسکی تحریروں میں اتنی بہت ساری باتیں پیدا نہیں ہو سکتی تھیں۔ اگر اس کے پس منظر میں صدیوں کی محنت اور ریاضت اس سلسلہ میں شامل نہیں ہوتی۔ قدیم شمالی سامری حرفوں پر قدیم ہندوستانی حرفوں کی گہری چھاپ ہے۔ بائیس سامری حرفوں میں متعدد حرفوں پر قدیم ہندوستانی اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ ساتویں صدی قبل مسیح بابل اور مغربی ہندوستان کے گہرے تعلقات سے بھی اس سلسلہ میں بہت ساری باتیں سامنے آگئی ہیں۔ کن پنڈی کا خیال عجیب ہے کہ جو ہندوستانی تجارت کے لئے بابل تک گئے تھے وہ وہاں سے آگے نہیں گئے۔ رائیس ڈیوڈس کے بھی اس خیال میں بھی وزن نہیں ہے کہ آٹھویں صدی قبل مسیح کے آخر میں اور

ساتویں صدی میں جو تاجر (دراوڑی) باہر گئے تھے وہ اکادی قوم کی تحریر اور اُن کا رسم الخط لیکر آئے تھے۔ اور دراصل اسی تحریر سے ہندوستانیوں نے لکھنا سیکھا۔ وہ برہمی رسم الخط کے متعلق کہتے ہیں کہ ہزار دل برس بعد اسی تحریر کے اثر سے برہمی رسم الخط کا وجود ہوا ہے۔ ہمیں یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ جس وقت کی تحریر ہمارے پیش نظر ہے اسمیں ہندوستانی زندگی کی خاص رنگت موجود ہے۔ ہندوستانی بولیوں میں بھی اس کا اس طرح مل جل جانا معمولی بات نہیں تھی۔ اس وقت تحریر کی جو صورت تھی اسمیں پختگی آور ہندوستان کی مٹی کی خوشبو ہے۔ ہر ہندوستانی فضا، ماحول، وقت اور حقیقت کے لیے تحریر میں وسعت تھی۔ گھل مل جانے والی کیفیت تھی۔ زبان کی وسعت، کیفیت اور گہرائی اس طرح پیدا نہیں ہو جاتی۔ قدیم ہندوستانیوں کی تحریر اور رسم الخط میں وقت کے خاص مطالبوں اور زمانہ کی خاص ضرورتوں کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ہندوستانی تاجر جاہل نہیں تھے۔ ان کی اپنی بولیوں کے لئے رسم الخط بھی تھا۔ ان کی تحریر سے افغانستان اور بابل کے علاوہ مصری اور یونانی بھی متاثر ہوئے تھے۔ ان کی تجارت کی وسعت اور ان کے جینے کے طریقوں سے بھی ان کے ذہن کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اب اس قسم کی باتیں کر کے عمرانیات اور لسانیات کے مسئلوں کو الجھانا مناسب نہیں ہے اس قسم کے ماہرین پتہ نہیں کیوں اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ آٹھویں اور ساتویں صدی قبل مسیح ہندوستانیوں کے پاس دبدک ادب کا بہت بڑا ذخیرہ موجود تھا۔ دبدک ادب کے متعلق صرف یہ کہہ کر دامن بچا لینا عجیب سی بات ہے کہ اس وقت ہندوستانی اپنے عظیم ادب کو صرف ذہن میں رکھے ہوئے تھے۔ رائس ڈیوس بھی یہی کہتے ہیں کہ اس وقت

ہندوستانیوں کے دماغ میں یہ ادب تھا۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ آریاؤں کے متعلق جنوبی ہندوستانیوں کو بہت کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ آریوں کے کلچر سے جنوبی ہندوستان متاثر ہو چکا تھا۔ جنوبی ہندوستان میں ویدوں کی باتوں کو لکھنے کی کوشش شروع ہو گئی تھی۔ پجاریوں نے اس طرف کافی دھیان دے رکھا تھا۔ ان کے پاس جو حروف تھے ان کو وہ خود حفاظت کرنا چاہتے تھے۔ اپنے دماغ کی ان باتوں کو پیش کرنے کے لئے انھوں نے چھوٹے چھوٹے نوٹ لکھے۔ یہ ضرور ہے کہ کوئی بڑی کتاب نہیں لکھی گئی۔ بعد میں ہندوستان میں تحریر کی جو صورت ملتی ہے۔ اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ صدیوں قبل فن تحریر پر محنت اور ریاضت ہوئی ہے۔ اگر اس دور میں ہندوستانیوں نے اپنے حرفوں کی حفاظت نہ کی ہوتی پجاریوں نے ویدک ادب کے عناصر کو نوٹ بنا کر نہ کئے ہوتے تو زبان اور بولیوں کے لئے وہ تحریر اور رسم الخط بعد میں نظر نہ آتا۔ جو ہمیں حاصل ہوا ہے۔ اس میں اور دیر لگتی۔ زبان اور بولیوں کے لئے رسم الخط اس طرح تیار نہیں ہو جاتا۔ یہ کوئی آسان کام نہیں۔ ویدک ادب کے اتنے بڑے سرمایہ کو صرف دماغ میں رکھنا ممکن نہ تھا اس دور کی جدوجہد، تجارت، تعلیم اور دوسرے سماجی عناصر کو دیکھکر یہ بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ اس وقت ہندوستان کے کلچر میں کافی زندگی آ چکی تھی۔ جب ہندوستانیوں نے پتوں اور اینٹوں پر لکھنا سیکھ لیا تھا۔ اس وقت تک بابل میں مٹی کی تختیوں پر باتیں تحریر کی جاتی تھیں۔ بعد کے ہندوستانی تاجروں کے پہنچنے کے بعد وہاں بھی اس سلسلہ میں تبدیلیاں آئیں اور وہاں کے لوگ بھی اس فن سے

آگاہ ہوئے۔ ہندوستان سے مختلف وقت میں مختلف باتیں باہر جاتی رہی ہیں۔ جنرل کننگھم نے بڑی جستجو اور تحقیق کے بعد یہ کہا ہے کہ ہندوستان کی زمین پر جو قدیم حروف نظر آتے ہیں۔ ان کا وجود ہندوستان ہی میں ہوا ہے اور ان کی اپنی انفرادیت بھی ہے۔ ان کے ارتقاء میں بھی ہندوستانی رنگت ہر جگہ ہے۔ ان پر باہر کے اثرات اس طور پر نہیں ہوئے ہیں یا ہندوستانیوں نے باہر سے الفاظ اور حروف اس طور نہیں لائے ہیں جس طور پر رائیس ڈیوس نے سوچا ہے۔ یہ حقیقت بھی دعوت غور و فکر دیتی ہے کہ جب ہندوستانیوں نے باہر سے حروف حاصل کئے تو پھر ان کے استعمال کے طریقے بھی باہر سے کیوں نہیں لائے؟ جہاں ایک چیز مل گئی تھی وہاں دوسری چیز بھی موجود تھی۔ انہیں صرف حرفوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ اپنی تجارت اور اپنی بھلائی کیلئے اور زندگی میں نئے انداز پیدا کرنے کے لئے اپنے دماغ میں محفوظ عظیم ادب کو پیش کرنے کے لئے انہیں جہاں حرفوں کی ضرورت تھی وہاں ان کے استعمال کے طریقوں کی بھی ضرورت تھی۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہندوستان کی مٹی سے حاصل کئے ہوئے حرفوں کو باہر کی چیز بنایا جائے اور ان کے استعمال کے طریقوں ان کے ارتقاء ان کی دوسری باتوں کو سمجھنے کے لئے ہندوستان کی اس فضا اور ماحول کو دیکھا جائے۔ جہاں انکی رنگت تمام پھیلی ہوئی ہے جب ہمارے سامنے اس وقت کا ہندوستان آتا ہے۔ آریوں اور دراوڑیوں کے کلچر، فکر اور اسکی عظمت آتی ہے اور ویدی ادب کے عظیم سرمایہ کا سارا جمال آتا ہے تو ہمیں ایسی باتیں انتہائی مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہیں۔ مختلف نظریوں اور مختلف خیالوں کے لوگوں نے

بہت سارے مسائل پھیلا رکھے تھے۔ ادب کے بھی بہت سارے پہلو نمایاں تھے۔ مختلف ڈھنگ اور مختلف طریقوں سے باتیں کہی جارہی تھیں۔ مختلف باتوں کی اپنی انفرادیت تھی۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک سکول نے دوسرے اسکول کے خیالات اور ادب کو محفوظ رکھنے کی کوشش نہیں کی لیکن یہ کہنا غلط ہے کہ اس وقت ساری باتیں دل کے ذریعہ اور دماغ کے ذریعہ ایک دوسرے کے پاس پہنچتی تھیں۔ وہ وقت تھا۔ جب ایک انسان دوسرے انسان کو سمجھنے کی بھرپور کوشش کررہا تھا۔ خیالات کا تجزیہ کیا جارہا تھا۔ مسائل کو سمجھا جارہا تھا۔ جنگلوں میں مختلف مدرسوں کے طالب علم سادھوں کی زندگی گذارتے تھے۔ اپنے اپنے مدرسوں کے اصولوں کے تقاضوں کو پورا کرتے تھے۔ بدھ کے پہلے ہندوستان میں ایک ایسے طبقہ کے بھی وجود کی مثالیں ملتی ہیں جس طبقہ کے لوگوں کو پاریب باجکا کہا گیا ہے۔ جس صورت میں یہ لوگ نظر آتے ہیں وہ قدیم استادوں اور معلّموں کی صورت ہے۔ یہ طبقہ سماجیات، فلسفہ، تصوف، فطرت اور محبت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتا تھا۔ ان کی تعلیم دیتا تھا۔ بہت ساری باتوں پر بحث کرتا تھا۔ برسوں ادھر ادھر گھوم کر حقیقت کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتا تھا۔ اس طبقہ کے لوگوں کے لئے بڑے بڑے ہال تعمیر کئے جاتے تھے تاکہ وہ وہاں لوگوں کے سامنے اظہار خیال کرسکیں ایسے ہال میں اس طبقہ کے لوگ تبادلۂ خیالات بھی کرتے تھے۔ یہ روایت اور آگے بڑھی ہے۔ مختلف دور میں اس قسم کے طبقے موجود ہیں۔ جب ایک ہی زبان لوگوں میں مقبول تھی۔ ایک ہی زبان سے لوگ ایکدوسرے کو سمجھتے تھے۔ کوروشتر سے مگدھ تک اور جنوبی ساوتھی سے نیپال

تک لوگ ایک خاص عام زبان میں باتیں کرتے تھے۔ اس وقت بھی فلسفہ، روحانیت، فطرت، تصوف اور محبت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے لئے ایسے لوگ موجود تھے جو برسوں ادھر ادھر جایا کرتے تھے۔ لوگوں کو زندگی کی حقیقتوں سے آگاہ کرتے تھے۔ یہ پڑھے لکھے لوگ سماج میں قدر کی نگاہوں سے دیکھے گئے۔ اس وقت کلاسیکی سنسکرت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اس طبقہ کے لوگ جس زبان میں باتیں کرتے تھے ظاہر ہے وہ زبان کافی محنتوں کے بعد سنواری گئی ہوگی۔ وہ سنجیدہ طبقوں میں ہر جگہ سمجھی جاتی تھی۔ مقامی بولیوں کا اس سے گہرا تعلق ضرور ہوگا عوام میں اس طبقے کے لوگوں کی بڑی عزت تھی۔ احترام کے ساتھ ان کے نام لئے جاتے تھے۔ ان لوگوں کی وجہ سے اس وقت کی زبان اور بولیوں کو بہت زندگی ملی ہے

دھماپاد (Dhama pada) کے مصنف کے نام کا کوئی پتہ اب تک نہیں چل سکا ہے۔ اس تخلیق میں چار سو تیئس ۴۲۳ اشعار ہیں جن میں بدھ ازم کی بنیادی باتوں کو شاعرانہ نزاکتوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اچھی باتیں اور اچھے اقوال ضرور جمع ہیں لیکن ان میں ایک تسلسل ہے۔ ایک خاص آہنگ، ایک خاص انداز بیان ہے۔ پیشکش کے انداز نے ہنیم کا سارا جمال سامنے رکھ دیا ہے۔ اخلاقی تعلیم کا معیار نہایت ہی اعلیٰ ہے۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ دھماپاد کے تمام اقوال گوتم بدھ کے ہیں اور ان میں ان کی زبان کی سنجیدگی، مزاج اور ان کے لہجہ کا رفا ہے۔ کچھ ماہرین اس سے متفق نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دھماپاد کے اقوال میں گوتم بدھ کے خیالات کی مکمل تصویر موجود ہے

لیکن اسکا مصنف کوئی اور ہے۔ مصنف نے گوتم بدھ کے خیالات کی تمام گہرائیوں اور گیرائیوں کو سمجھ کر ان کے اصولوں کی تمام نزاکتوں کو ان کے اصل روپ میں پیش کیا ہے۔ دھمّاپاد کے مطالعہ سے ایک بڑی حقیقت جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اخلاقی احساسات اور جذبات میں یقین دلانے والی آواز کے آہنگ کو محسوس کیا جائے۔ انفرادی قوتوں پر ہر جگہ زور دیا گیا ہے۔ بُرے جذبات کو دور کرنے اور مقاصد میں ایک عام اور صالح انسان کی طرح جد و جہد کرنے کی تلقین کیگئی ہے۔ خیالات میں پختگی اور غم و غصّہ سے فراز کو زندگی کا ایک مقصد بتایا گیا ہے۔ اخلاقی آزادی کی اہمیت پر بھی کافی زور دیا گیا ہے۔ اس طرح نجات حاصل کرنے کی ایک راہ بھی سامنے آجاتی ہے۔ ایک جگہ بدھ ازم کے کچھ اصولوں اور خاص نظریوں پر اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے۔

"جس طرح کوئی چرواہا شام کو اپنے تمام مویشیوں کو لیکر گھر جاتا ہے۔ اس طرح عمر اور موت انسان کی زندگی کو لیجاتی ہے"

"ایک انسان جو ایک سو برس تک زندہ رہتا ہے اور حقیقتوں کا اسے علم نہیں ہوتا اسکی زندگی سے اس انسان کی زندگی اعلیٰ ہے جو ایک روز زندہ رہتا ہے اور اسکی نگاہیں حقیقتوں کو سمجھنے لگتی ہیں"۔

"ایک انسان جو ایک سو برس زندہ رہتا ہے اور کمزور اور بیکار رہتا ہے۔ اسکی زندگی سے اس انسان کی زندگی بہتر ہے جو اپنی طاقت اور قوت کے ساتھ ایک روز زندہ رہتا ہے"۔

"ایک جاہل شخص کی زندگی بڑھاپے میں ایک بوڑھے بیل کی طرح ہوتی ہے۔ اسکا جسم بڑھ جاتا ہے لیکن اسکی عقل نہیں بڑھتی"۔

" اپنے آپ کو جگانے کے لئے اپنی قوت سے کام لیا جائے۔ اپنے تجزیہ کے لئے اپنی شخصیت کا سہارا لینا چاہیئے۔ خوشی کی زندگی کے لئے اپنی حفاظت بہت ضروری ہے۔

" خودی انسان پر حکومت کرتی ہے۔ خود کو خودی کے حوالے کر دو وہ تمہیں اسی طرح لیجائے گی جس طرح کوئی تجربہ کار تاجر اپنے وفادار گھوڑے کو لیکر چلتا ہے"۔

"بری زندگی میں خیالات کا کوئی تسلسل نہیں ہوتا۔ خیالات کی روح نہیں ہوتی"۔

اس قسم کی سینکڑوں باتیں دھما پاد میں موجود ہیں۔ بعض باتیں بار بار دہرائی گئی ہیں۔ دنیا میں مذہبی اصولوں کو اس طرح پیش کرنے کی مثالیں بہت ہی کم ہونگی۔ بہت ساری ادبی نزاکتوں کے ساتھ ہندوستان میں دھما پاد سے مذہبی اصولوں کو پیش کرنے میں جدت آئی۔ اس میں زندگی کی حقیقتوں پر صاف صاف باتیں کی گئی ہیں۔ اس کے مطالعہ کے وقت ہمیں اس دور کے ہندوستان کو سامنے رکھنا ہوگا۔ ورنہ اتنی بڑی تخلیق کے ساتھ ہم انصاف نہیں کر سکیں گے۔

کچھ ماہرین دھما پاد اور بھگوت گیتا کا مقابلہ کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ دھما پاد کی خصوصیتیں بھگوت گیتا کی خصوصیتوں سے زیادہ چمک اور زندگی رکھتی ہیں۔ اس طرح دونوں تخلیقات کا مقابلہ کرنا درست اور مناسب نہ ہوگا۔ بھگوت گیتا کی تخلیق کا جائزہ لیتے وقت ہمیں اسکی زبان کی خصوصیتوں اور خیالات کی پیشکش کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔ دھما پاد میں جو باتیں کی گئی ہیں وہ صاف صاف کی

گئی ہیں۔ زندگی کی تمام حقیقتوں سے تمام پردے ایک ساتھ اٹھا دئے گئے ہیں۔ اس چابکدستی سے اس عظیم تخلیق میں انگنت خوبصورت عناصر جمع ہو گئے ہیں۔ بھگوت گیتا میں زندگی کے فلسفے ہیں۔ دھماپاد میں زندگی کے فلسفوں کے تجزیہ کے بعد حاصل کئے ہوئے تجربے ہیں۔ گیتا میں ڈرامائی کیفیت ہے اور یہاں شاعرانہ نزاکتیں۔ دھماپاد میں ایک بزرگ کی نصیحتیں ہیں گیتا میں ایک دوست، فلسفی اور تجربہ کار انسان کے مشورے ہیں۔ دونوں تخلیقات نے دنیا کے کلچر میں سوچنے اور لکھنے کا معیار قائم کیا ہے دونوں میں دو مختلف ہندوستان ہے لیکن ایک تسلسل ہے اور ذہنی ارتقا کا بھی صاف طور پر پتہ چلتا ہے۔ دھماپاد میں جو باتیں ہیں کم و بیش وہی باتیں کنفوشیش کے اخلاقی اصولوں کی باتیں ہیں۔ عام انسانوں کی روحانی اور مادی تعلیم کے لئے دھماپاد کے صفحات ہر وقت کھلے ہوئے ہیں۔ آج بھی ہم اسکی تحریر سے متاثر ہوتے ہیں اور ہمیشہ ہوتے رہیں گے۔

پنچ تنتر میں ستاسی کہانیاں ہیں۔ ڈاکٹر ہرٹل (Hertel) کا خیال ہے کہ پنچ تنتر دوسری صدی قبل مسیح کشمیر میں لکھی گئی لیکن اسکی بارہ کہانیاں ایسی ہیں جو اور بھی قدیم ہیں اور سنسکرت میں ان کے قبل لکھی جا چکی ہیں۔ قدیم یونان کی کہانیوں پر پنچ تنتر کے گہرے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ ارنسٹ رائیس (Ernest Rhys) نے لکھا ہے کہ ہمیں اسکا اقرار کرنا ہوگا کہ یونان میں جانوروں کی قدیم کہانیاں ہندوستان سے آئی ہیں۔ پنچ تنتر کی کہانیاں اپنی صورت اور تکنیک کے ساتھ باہر گئی ہیں۔ ان کی تکنیک میں ہندوستانی رنگ و روپ موجود

ہے۔ بعض ماہرین نے اسکی ناکام کوشش کی ہے کہ اس حقیقت کو پیش کیا ہے کہ ہندوستان کی ان کہانیوں پر یونان اور مصر کی کہانیوں کا اثر ہے بعض ماہرین اس صورت میں بھی ناکام رہے ہیں کہ یہ ثابت کیا جائے کہ کچھ کہانیاں ہندوستان سے یونان گئیں۔ اور کچھ یونان سے ہندوستان آئی ہیں۔ پنچ تنتر میں ہر جگہ ہندوستان کا کلچر جھلک رہا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کچھ کہانیوں پر یونان اور دوسرے ممالک کا اثر ہوا ہے۔ پرندوں اور جانوروں کے نام میں فرق آگیا ہے لیکن حقیقت جس کی بنیاد ہندوستانی کلچر میں ہے نہیں بدلی۔ آریہ کلچر کی گہری چھاپ ہر جگہ موجود ہے۔ ۱۸۵۹ء میں ٹی۔ بنفی نے پنچ تنتر کا ترجمہ کیا تھا اور اسکی کہانیوں کے جانوروں کا تقابلی مطالعہ کیا تھا۔ ولیم جونس اور فرنیز بوپ (F. Bopp) نے بھی اس سلسلہ میں بہت محنت کی ہے یونانی، لاطینی اور سنسکرت الفاظ کا مطالعہ کیا ہے اور تحقیق کی ہے رولنسن (Rawlinson) نے اس سلسلہ میں تحقیق کے بعد یہ بات صاف کردی ہے کہ پنچ تنتر کی کہانیاں مشرق سے مغرب کی طرف گئی تھیں اور اس بڑی حقیقت سے ہم انکار نہیں کرسکتے۔ اس کا خیال ہے کہ تھوڑے لمحہ کے لئے بھی ایسا سوچنا مناسب نہیں ہے کہ یہ کہانیاں مغرب سے مشرق کی طرف آئی ہیں۔ رولنسن نے کہا ہے کہ پنچ تنتر کی کہانیوں میں جو اہم جانور اور پرندے ہیں وہ ہندوستانی ہیں۔ مثلاً شیر، گیدڑ، ہاتھی اور مور وغیرہ سانپ اور مینڈک میں بھی ہندوستانی تہذیب کے عناصر موجود ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ مغرب میں ہندوستان کا گیدڑ لومڑی بن گیا ہے شیر اور سیدڑ کا تعلق تو ٹھیک ہے۔ اس کے متعلق سوچا اور لکھا جاسکتا ہے

مگر مچھ، بندر اور گیدڑ تو یونان میں نہیں ہیں۔ یہ تو ہندوستان کے جانور ہیں۔ پنچ تنتر کی تخلیق جو مقصد ہے وہ یہ ہے کہ انسانی فطرت کے متعلق زیادہ سے زیادہ باتیں سکھائی جائیں۔ جانوروں کی دنیا سے ایسی باتوں کو چن کر پیش کیا جائے جن سے انسان واقف ہے اور جن سے انسان کو عملی جدوجہد میں بہت کچھ مدد مل سکے۔ پنچ تنتر کے خالق کو اپنے مقصد میں بہت کامیابی حاصل ہوئی۔ اسلئے مقصد کی وہ تیزی وہ عناصر جن سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ اپنے تمام اثرات ختم کر بیٹھے۔

پنچ تنتر نے ہندوستانی زندگی کی ابتدائی منزلوں میں انسان کو اپنے کو پہچاننے، مسرت حاصل کرنے اور دوستوں اور لوگوں سے بہتر تعلقات پیدا کرنے میں بہت مدد دی ہے۔ پانچ ہزار سال سے زیادہ عرصہ تک پنچ تنتر کی کہانیوں نے ہندوستانیوں کی زندگی کی خاموش اصلاح کی ہے۔ ڈاکٹر ہرٹل کا خیال ہے کہ دو سو برس قبل مسیح اسکی تخلیق کشمیر میں ہوئی تھی۔ اس سے یہ بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اس وقت تک بہت ساری کہانیاں وجود میں آچکی تھیں۔ ویدوں میں کہانیوں کا [illegible] موجود ہیں۔ مختلف قسم کی کہانیاں ہندوستان میں ہمیشہ مقبول رہی ہیں۔ ہر کہانی کا کوئی نہ کوئی مقصد رہا ہے۔ اچھے خیالات کو پیش کرنے کے لئے ننھی ننھی کہانیوں کا سہارا لیا گیا ہے۔ رگ وید میں صاف طور پر کہانیاں نہیں ملتی ہیں لیکن بعض عناصر ایسے موجود ہیں جن سے اسکا پتہ چلتا ہے کہ اس وقت بھی ہندوستانی کہانیوں کی طرف [illegible] تھے۔ رگ وید میں جہاں برہمنوں کو مینڈک کہا

گیا ہے وہاں ہمیں اس سلسلہ میں سوچنا پڑتا ہے۔

انسان اور جانوروں کے تعلق کے متعلق ہندوستان میں بہت پہلے سوچا جا چکا تھا۔ انسانی جذبات اور کردار کے لئے جانوروں کی حرکتوں سے مثالیں دی گئی ہیں۔ اپنشادیں بھی انسان اور جانوروں کے تعلق پر خوب باتیں کی گئی ہیں۔ چڑیا، سانڈ اور کتے جانور اہم رول ادا کرتے ہیں۔ ان کی مثالوں سے انسان کی حرکتو پر طنز بھی کیا گیا ہے۔ پنچ تنتر کی کہانیوں پر کچھ بھی سوچتے ہوئے ہمیں ان باتوں پر بھی سوچنا پڑتا ہے۔ اس طرح اسکی کہانیوں کے ارتقاء کو بھی سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ پنچ تنتر کی کہانیوں میں بڑی وسعت ہے۔ لیکن اسے فن کا اعلیٰ نمونہ نہیں کہا جاسکتا۔ تمام کہانیوں میں ایک تسلسل ہے۔ اس سے مقصد کی ہمہ گیری کا بھی گہرا احساس ہوتا ہے۔ پنچ تنتر کے مصنف کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ وہ کوئی برہمن ضرور تھا۔ لیکن یہ کہنا کہ اسکا نام واقعی وشنو کارمن تھا۔ میرے خیال میں درست نہیں اسلئے کہ اسکا مصنف کوئی اور بھی ہوسکتا ہے، وشنو کارمن کو مصنف قبول کرکے ہمیں دکن میں پنچ تنتر کی تخلیق کو تلاش کرنا ہوگا۔ اس کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس نے دکن کے راجہ امر کاکتی کے کند ذہن لڑکوں کی تعلیم کے لئے یہ کہانیاں لکھی تھیں۔ ہر تخلیق کی تخلیق سے جو باتیں اس سلسلہ میں زیادہ صاف ہوتی ہیں وہ وشنو کارمن کو مصنف قبول کرکے اور دکن میں پنچ تنتر کی تخلیق کے متعلق سوچ کر زیادہ سے زیادہ وضاحتی ہو جاتی ہیں۔ پنچ تنتر کے

اصلی مسودہ سے بھی ہمیں ہرٹل کے خیالات سے اتفاق کرنا ہوگا۔
یہ کہنا بھی نامناسب نہ ہوگا کہ چونکہ پنچ تنتر میں
پانچ عنوانات قائم ہیں۔ اس لئے بھی اس کا نام یہ ہے۔ اس کتاب
میں پانچ مختلف حصے ہیں۔ بعض مصنفین اس میں پانچ مختلف ملکوں
کی کہانیاں دیکھتے ہیں اور یہ عجیب بات ہے۔ مصنف نے مقصد کے
لئے کہانیوں میں کسی قسم کی کمی نہیں کی ہے اور نہ ایسے حصے نکال
دیئے ہیں۔ جن کی ضرورت اس طور پر نہیں تھی۔ کہ ان سے شہزادوں کو
سیاست اور عملی زندگی کے اصول کو سمجھنے میں کوئی مدد نہ ملی تھی۔ کہانیوں کی
بہت ساری خصوصیتیں اس طرح ہمیشہ زندہ رہ گئی ہیں۔ پنچ تنتر میں
مذہبی، فلسفیانہ اور اخلاقی باتوں کا رنگ و روپ ہر جگہ موجود ہے
کسی کہانی میں ساحل کی ایک چڑیا سمندر کو دھمکاتی ہے۔ کسی میں
ایک کمزور چوہے کے تجربے ہیں۔ کہیں ایمانداری کو زندگی کی سب
سے بڑی دولت کہا گیا ہے۔ ایک کہانی میں ایک گیدڑ اس
بات کی تحقیق کرتا ہے کہ جس ڈھول کی آواز سے وہ ڈر گیا تھا۔ اس میں
صرف چمڑا لگا ہوا ہے اور اندر سے ڈھول خالی ہے کسی کہانی
میں ایک شہر کی شکست ایک چالاک اور ہوشیار خرگوش سے ہوتی
ہے۔ کہیں بیوقوف اونٹ کی کہانی ہے (اونٹ اور ہاتھی کا ذکر
پنچ تنتر کے اصل مسودہ میں نہیں ہے) ایک کہانی میں ایک سوداگر کا لڑکا
ایک ہزار من لوہا اپنے ایک دوست کے پاس رکھتا ہے۔ جب وہ
اپنی چیز مانگتا ہے۔ اس کا دوست یہ جواب دیتا ہے کہ چوہے تمام

لوہا کھا گئے۔ یہ سنکر سوداگر کا بیٹا اپنے دوست کے ننھے لڑکے کو پکڑ لیتا ہے اور پوچھنے پر کہتا ہے کہ اسکو باز اٹھا کر لے گیا اور پھر قاضی کے پاس فیصلہ ہوتا ہے اور اسکا لوہا واپس مل جاتا ہے دوستوں کو اپنی محبت اور اپنے خلوص کا گہرا احساس دلانا، جنگ اور اس کی حقیقت کو سمجھنا، شاہی اصولوں سے آگاہ ہونا۔ یہ ساری باتیں پنچ تنتر میں موجود ہیں۔ زبان میں سادگی ہے لیکن وہ پرکاری اور فنکاری نہیں جس کی ضرورت تھی۔ نثر کی بہت ساری خصوصیتیں نمایاں ہوتی ہیں۔ لہجہ میں ایک خاص قسم کی تابناکی ہے اور یہی تابناکی ہر کہانی میں کچھ کردار ابھارتی ہے جذبات کے اظہار میں توازن ہے۔ جہاں شاعری کی گئی ہے۔ بعض شاعرانہ نزاکتیں یہاں لطف دے جاتی ہیں۔ پنچ تنتر میں ایک خاص سٹائل ہے جس سے مصنف کے مزاج کا بھی صاف طور پر پتہ چلتا ہے سنسکرت زبان میں یہاں وہ ساری باتیں موجود ہیں جو اونچے طبقہ میں پہنچکر اس میں پیدا ہو گئی تھیں الفاظ کی تکرار سے بعض جگہ بہت زیادہ لطف پیدا ہو گیا ہے۔ سمجھنے میں کسی قسم کی کوئی خاص دشواری نہیں ہوتی۔ ایک کی سادگی، تنائی، جوش اور پاکیزگی یہاں تلاش کرنا مناسب نہ ہوگا۔

ختم شد

سونٹرل (کشمیری افسانے)

(قوس قزح)

کشمیری زبان میں ادب کی تاریخ بہت ہی مختصر ہے لیکن اس کے باوجود یہ ہندوستان کی کسی بھی زبان کے نثری ادب کے مقابلہ میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ کشمیری ادیبوں کے اس دعوے کی دلیل میں ہم اختر محی الدین کے کشمیری افسانوں کا یہ مجموعہ آپکے سامنے پیش کرتے ہیں

اس مجموعہ میں سات افسانے ہیں جو ہماری زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہیں۔ تمام افسانوں کے کردار ہماری سماجی زندگی سے حاصل کئے گئے ہیں اور ایک عظیم مقصد لئے ہوئے ہمارے سامنے پیش کئے گئے ہیں۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے

پبلشر

شاہین بک سٹال امیرا کدل سرینگر

ادب اور تہذیب

شکیل الرحمٰن کے انتقادی مقالات کا تیسرا مجموعہ ہے ادبی قدروں کے تعین اور نئے ادبی رجحانات کو سمجھنے کیلئے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔ عملی تنقید کے اصولوں پر شکیل الرحمٰن کی نظر بہت گہری ہے۔ ادب اور تہذیب کے مقالے دعوت غور و فکر دیتے ہیں۔ شکیل الرحمٰن کے تنقیدی اسلوب میں جو انفرادیت ہے۔ وہ کسی اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ آپ نئی نسل کے وہ نوجوان نقاد ہیں۔ جن کے طرز تحریر سے اردو کے بعض اچھے ادیب متاثر ہیں اور ان کے خاص رنگ سے اثر لیکر فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ایک بے باک نقاد کی یہ کتاب بہت کچھ سوچنے کی دعوت دے رہی ہے۔ قیمت چار روپے

غ م

شاہین بک سٹال سرینگر

شعور اور تنقیدی شعور

(تنقیدی مقالات) شکیل الرحمٰن

آج جبکہ ہمارے نقاد خاموش ہیں۔ اور ادب میں جمود کی بات کر کے خاموش رہنے کی ایک وجہ سمجھ رہے ہیں شکیل الرحمٰن تنہا ترقی پسند نقاد ہیں جو اس دور میں بھی اپنے بے باک قلم سے لکھتے جا رہے ہیں۔ اور پڑھا لکھا طبقہ انکی تحریروں سے متاثر ہو رہا ہے۔ اس کتاب کی تعریف ڈاکٹر ذاکر حسین گورنر صوبہ بہار، نیاز فتحپوری فراق گورکھپوری، اور علی سردار جعفری نے بھی کی ہے۔ آل انڈیا ریڈیو نے تبصرہ کیا ہے۔ "نگار" لکھنؤ اور "شاہراہ" دہلی نے بھی تبصرہ کرتے ہوئے یہ لکھا ہے۔ کہ عملی تنقید کے اصولوں پر شکیل الرحمٰن کی نظر گہری ہے۔ فیض، منٹو، احمد ندیم قاسمی اور تیوی، مخدوم کے فن پر بڑی بے باک تنقید ملے گی۔ اردو غزل کی تکنیک اور دوسرے مقالے بھی بہت اہم ہیں۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے

پبلشرز

شاہین بک سٹال سرینگر کشمیر

سنگتراش

ادب کو زندگی اور اسکے بنیادی مسائل کا ترجمان ہونا چاہیئے۔ ادب انسان کو بھوک افلاس، سماجی پستی، غلامی سے نجات حاصل کرنے اور زندگی کو بہتر بنانے کی جد و جہد کا احساس دلا سکتا ہے۔ مرحوم پریم ناتھ پردیسی بھی ان ہی ایماندار ادیبوں میں سے تھے جو ادب کو اپنی زندگی کا ماحصل سمجھتے تھے۔ "سنگتراش" اپنے افسانوں کی طرح ڈراموں کے اس حسین مجموعے میں بھی پردیسی آپ کو ان ہی اصولوں کی ترجمانی کرتے نظر آئینگے

مرحوم پریم ناتھ پردیسی ہند و پاک کے مشہور افسانہ نگار اور مادر کشمیر کے اس مایہ ناز ادیب کے افسانوں میں آپ اپنی زندگی کی جھلکیاں دیکھ چکے ہیں اور اسی طرح مرحوم کے ان ڈراموں میں بھی آپکو اپنے دل کی دھڑکنوں کا احساس ہوگا۔

پردیسی کی کہانیوں کے کئی مجموعے آپکی نظروں میں آچکے ہیں لیکن ان کے ڈراموں کا مجموعہ آج پہلی بار چھپ رہا ہے۔ "سنگتراش" پورے ایک درجن منتخب اور شاہکار ڈراموں کا یہ بیش بہا مجموعہ جسکا ہر ڈرامہ ہماری زندگی کے ہر رخ کی نقاب کشائی کرتا ہے۔ ہندوستان کے مشہور ادیب سید احتشام حسین، پریم ناتھ در، سہیل عظیم آبادی، کرشن چندر، اور رامانند ساگر وغیرہ مرحوم پردیسی کے کافی مداح تھے۔ ہند و پاک کے چوٹی کے ادیب مادر کشمیر کے اس ہونہار فرزند کی حب الوطنی، حقیقت نگاری، دیانتداری، خلوص، متانت، سنجیدگی اور ادبی صلاحیتوں کے معترف تھے۔ اس ہی نہ بھولنے والے پردیسی کے ڈراموں کے ضخیم مجموعے "سنگتراش" کو آج ہی اپنے لئے محفوظ کرا لیں۔ جو پردیسی کے قلم کا نچوڑ ہے۔ کشمیر کی ادبی تاریخ میں آج پہلی بار اردو ڈراموں کا یہ بہترین مجموعہ منظر عام پر آرہا ہے جو خود پریم ناتھ پردیسی کی بے مثال ہے۔ قیمت ساڑھے تین روپیہ

ملنے کا پتہ:- شاہین بک سٹال امیرا کدل سرینگر

40. The Vedanta Philosophy by Max Muller
41. A History of Egypt by Prof. James Henry Breasted
42. The wonder that was India by A. L. Bashain
43. Ancient India–History & Culture by B. G Gokhale Ph. D
44. Prehistoric India by S. Piggoh
45. Mohenjo-daro & the Indus Civilization Vol 1. II, III by J. Marshall
46 Early Indus Civilization 2nd Ed. by E. Mackay
47. The Vedic Age by Majumdar
48. Political History of Ancient India by H. C. Raychoudhuri
49. Buddhism and Ashoka by Gokhale
50. India and China by P. C. Bagchi
51 History of Poli Literature Vol 1, II by Law
52 Ramayana by Smt Sudha Muzamdar
53 Mahabharata by Shri Rajagopalachari
54 Panchtantra by Arther W. Ryder
55 Bhagwat Gita Translated by Swami Parmananda
56. Rigveda Vol. 1, II, III, IV
57 The Mahabharat—A criticism by C. V. Vaidya M.A.L.L.B.
58. History of the world edited by W. N. Weech
59. My country and my people by Llu-yntang
60. Great Epic of India by E. W. Hopkins
61 Women in Vedic Age by Smt Shakuntala Rao Shashtri
62 Assamese Literature by Birinch Kumar Berna
63. Telugu Literature (Andhra Lit.) by P. T. Raju
64. Kashmir—its cultural heritage by Kamudi
65 Keys to Kashmir Lala Rookh Publications, Srinagar
66 History of Kashmiri Pandits by Jia Lal Kilam
67. Linguistic Studies from the Himalay's by T. Graham Baily
68 Story of Civilization by Beeker and Binelfe
69 An Introduction to the comparative Philsophy of Indo-Aryan Languages by R. V. Zahgildar
70 Founeations of Languages by Lou's H. Cray
71. The Dharmmapada translated by F. Max Muller

"زبان اور کلچر" لکھتے ہوے جو کتابیں پیش نظر رہیں اُن میں سے
کتابوں کی فہرست حسب زیل ہے :—

A History of Sanskrit Literature by Berriedale Keith D.C.L., D.L.H.
Linguistic-Introduction to Sanskrit by Balakrishna Ghosh Dr. Phi (Munch)
A History of Indian Literature by M Wintermitz Ph. D. (Czech.)
Economic life and Progress in Ancient India by Narayanchandra Bandhyapadhyaya
Early History of India by N. N. Ghose
Buddhist India by Rhys Davids
Life in Ancient India by Adolf Kaegi
Mundars Grammar Part I by Rev. J. Hoffman
Linguistic Survey of India Vol. 1 Part 1 by Sir G. Girrerson
Linguistic Survey of India Vol. IX Part 1 by Sir G Girrerson
Morphology of the Tibetan Language by Yow Koerber Hans Nordewn
Articles on India by Karal Marx
Historical Grammar of Japanese by Samsom
The Chinese Language by R. A. D. Forest
Comparative Grammar of the Dravidian Languages by Galdwell
Ancient Man by Van Loon
Philosophy of Language by Sir J. Stoddert
The Dwellers of the Nile by Sir E. A. Wallis Bridge K. T
A History of Russian Literature by D S. Mirky
The Loom of Language by Fredrick Bodnov
A comparative Grammar of Modern Aryan Languages Vol. 1 by J. Beams
Indo-Aryan & Hindi by Dr. S. K. Chatterjee
Languages & the Linguistic problem by Dr. S. K. Chatterjee
Political Economy by Jhon Eaton
Concerning Marxism in Linguistics by J. V. Staln
The Origin of the family by F. Engles
Ancient Society by L H. Morgan
The story of Mankind by H. Vanloom
India today by Rajni Palm Dutt
Harmsworth's Universal Encyclopadia Vol. II.
-do- -do- -do- Vol. III
-do- -do- -do- Vol. VII
-do- -do- -do- Vol. XII
The History of Japan by Kenneth Scott
History of Greece by J. C. Bury
The National Culture of India by Dr. Abid Hussain
Indian Philosophy Vol. 1 by Dr. Radha Krishnan
The Discovery of India by Jawahir Lal Nehru
Glimpses of the world History by Jawahir Lal Nehru

The University Library

ALLAHABAD.

178058

Accession No. Urdu

Call No. ~~U-U~~ 409-U
~~12~~ 27

(Form No. 28 L 75,000—57)